رؤف پاریکھ

لغات اور فرہنگیں

رؤف پاریکھ

CITY BOOK POINT Naveed Square.Urdu Bazzar, Karachi
Ph # 021-32762483

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

نام کتاب: لغات اور فرہنگیں

مصنف: رؤف پاریکھ

ناشر: سٹی بک پوائنٹ

تعداد: 500

اشاعت سن: 2021ء

قیمت: =/450 روپے

انتساب

سجاد،

فرحان

اور

اویس

کے نام

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ
(اقبال)

فہرست

معروضات

اس کتاب میں شامل مقالات میں اردو کی کچھ لغات اور فرہنگوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ کوئی دعویٰ نہیں ہے لیکن الحمدللہ بعض مسائل ومباحث پہلی بار ان مقالات میں پیش ہوئے ہیں۔ تاہم اب بھی اردو لغت نویسی اور لغات سے متعلق کئی موضوعات ایسے جن پر کام کیا جانا چاہیے۔ بقولِ میر:

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ، ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

یہ مقالات مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور زیرِ نظر اشاعت میں ان میں سے بعض میں کچھ ترامیم اور اضافے کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ ان طالب علموں کے لیے بطور خاص مفید ثابت ہوں گے جو جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی میں لغت نویسی پر تحقیق کرنا یا اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہتے ہوں۔

ان مقالات پر حسبِ سابق محمد احسن خاں صاحب (لاہور) سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور حسبِ سابق بعض نکات پر ان سے مدد اور رہ نمائی ملی۔ ان کا شکریہ رسمی طور پر نہیں بلکہ دل سے ادا کرتا ہوں کہ زبان اور لغت کے مسائل پر رہ نمائی کرنے والے اب خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اللہ انھیں صحت مند اور تا دیر سلامت رکھے۔ آمین۔

وصی اللہ کھوکھر صاحب کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے کہ انھوں نے مسودے میں ایک دو فروگذاشتوں کی نشان دہی کی اور ان کی تصحیح کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

سٹی بک پوائنٹ کے آصف حسن صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے کتاب کی فوری اور خوب صورت طباعت کا اردواہ ظاہر کیا۔ محمد صابر جمیل عدنانی صاحب کا بھی شکریہ کہ انھوں نے اس کتاب کی کمپیوٹر پر صورت گری میں بہت مدد کی ورنہ تکنیکی مسائل سے نبرد آزما ہونا میرے بس کی بات نہیں۔

رؤف پاریکھ

drraufparekh@yahoo.com

۰۳۰۰ _ ۲۱۰ ۱۸۶۴

فرہنگیں اور اردو میں ادبی متون کی فرہنگیں:
اصول اور مباحث

خوشی کی بات ہے کہ ہماری جامعات میں اردو کے اہم ادیبوں اور شاعروں کے متون کی فرہنگیں بنائی جارہی ہیں۔ یہ بہت اہم کام ہے اور ان فرہنگوں کے ذریعے ایسے سیکڑوں الفاظ اور مرکب مع اسناد سامنے آئیں گے جو یا تو اردو کی کسی لغت میں موجود نہیں ہیں، یا ان کے معنی نامکمل اور ناکافی ہیں یا ان کی اسناد دست یاب نہیں ہیں۔

اہم ادبی متون کی فرہنگوں کی تیاری وہ کام ہے جو گویا مستقبل کے لغت نویسوں کی مدد کرے گا اور ہماری خوب صورت زبان کی ثروت میں اضافے کا باعث ہوگا۔ یہ کام ہمیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ ہندوستان میں ہندی کے کئی بڑے ادیبوں کی فرہنگیں بنائی جا چکی ہیں۔ البتہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں تحقیق کے بعض طالب علم ادبی فرہنگ مرتب کرنے کی ذمے داری (بطور تحقیقی مقالہ) اٹھا تو لیتے ہیں لیکن اس کام کے اصولوں، مقاصد اور طریقِ کار سے کماحقہ آگاہ نہیں ہوتے اور سخت محنت کے باوجود ان کے کام میں کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ یہ طالب علمانہ معروضات ایسے ہی طالب علم دوستوں کی رہ نمائی کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔ اگرچہ راقم کو رہ نما ہونے کا دعویٰ نہیں ہے لیکن جو محدود معلومات میسر ہیں انھیں اس خیال سے پیش کیا جارہا ہے کہ شاید کسی طالب علم کا بھلا ہو جائے۔ ویسے اساتذہ بالخصوص تحقیقی کاموں کے نگراں اساتذہ کے بھی اس کے پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ یہاں مجرد اصول اور نظری مباحث کے ساتھ اردو زبان و ادب سے عملی مثالیں پیش کی جائیں۔

☆فرہنگ اور لغت

فرہنگ فارسی زبان کا لفظ ہے اور فارسی میں اس کے معنی ہیں لغت۔ لغت یا ڈکشنری (dictionary) کا مفہوم، جو عام طور پر کئی کتب میں مل جاتا ہے، یہ ہے: ''وہ کتاب یا فہرستِ الفاظ جو کسی زبان کے الفاظ (بالعموم حروفِ تہجی کی ترتیب سے) درج کر کے ان کے معنی ومترادفات مع تلفظ اور قواعدی حیثیت بیان کرے''[۱]۔ ان خصوصیات کے علاوہ بعض لغات الفاظ کا ماخذ/اشتقاق بھی درج کرتی ہیں۔ گویا جسے انگریزی میں ڈکشنری (dictionary) کہتے ہیں اسے اردو میں لغت اور فارسی میں فرہنگ کہتے ہیں۔ فارسی میں لغت کو فرہنگ نامہ، لغت نامہ اور واژہ نامہ بھی کہتے ہیں (فارسی میں واژہ کے معنی ہیں ''لفظ'')[۲]۔ لغت عربی زبان کا لفظ ہے لیکن عربی میں اس کے اور بھی کئی معنی ہیں اور عربی میں لغت یا ڈکشنری کو کتاب اللغہ کے علاوہ معجم اور قاموس بھی کہتے ہیں۔ قاموس دراصل ایک مشہور عربی لغت کا نام ہے گو موجودہ دور میں عربی میں ہر ڈکشنری کو قاموس کہتے ہیں[۳]۔ البتہ لفظ ''لغت'' کے عربی میں کئی معنی ہیں، مثلاً اس کے ایک اور معنی ہیں: کلمہ یا بامعنی لفظ۔

اردو میں بھی لفظ لغت کے ایک معنی ''بامعنی کلمہ'' یا ''بامعنی لفظ'' کے ہیں، نیز اردو میں لفظ لغت کے ایک اور معنی بھی ہیں اور وہ ہیں: وہ لفظ یا ترکیب جس کا لغت میں اندراج کیا جا سکے۔ یعنی ''ڈکشنری'' کے مفہوم میں مستعمل ہونے کے ساتھ ساتھ لفظ ''لغت'' کے ایک معنی اردو میں ''ڈکشنری میں اندراج کے قابل بامعنی لفظ'' کے بھی ہیں۔ جب راقم اردو لغت بورڈ سے وابستہ تھا تو ہمارے عملے کا کوئی رکن کسی لفظ یا مرکب کا کارڈ بنا کر اور اس کی سند لکھ کر لے آتا تاکہ اسے بطور اندراج لغت میں شامل کیا جا سکے لیکن کبھی کبھار ہمارے بعض ساتھی اس پر اعتراض کرتے کہ یہ ''لغت'' نہیں ہے، یعنی یہ ایسا لفظ یا مرکب نہیں ہے جس کی تشریح درکار ہو اور اس کا اندراج لغت میں بطور راس لفظ یا لغوی اندراج کے کیا جائے۔ دراصل ہر لفظ یا مرکب اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے لغت یا فرہنگ میں درج کیا جائے (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

☆فرہنگ اور لغت میں کیا فرق ہے؟

اردو میں بھی کسی زمانے میں فرہنگ کا لفظ لغت کے معنی میں مستعمل رہا ہے۔ مثلاً فرہنگِ

آصفیہ (مولفہ سید احمد دہلوی) دراصل ایک لغت ہی ہے اور اس کے نام میں فرہنگ کا لفظ ڈکشنری یا لغت ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ اسی طرح کچھ عرصے قبل کی مرتبہ ''فرہنگِ کارواں'' (از فضل الٰہی عارف) بھی دراصل لغت ہی ہے۔ لیکن اب لغت کے لیے اردو میں فرہنگ کا لفظ بہت کم استعمال ہوتا ہے اور اب اردو میں فرہنگ کا لفظ ایک مختلف اور مخصوص معنی میں رائج ہو گیا ہے (اور یہ معنی شاید ہی اردو کی کسی لغت میں درج ہوں)۔

اردو کی مختلف لغات میں لفظ ''فرہنگ'' کا مفہوم ''لغت، معنوں کی کتاب، عقل و دانش'' وغیرہ درج ہے (فارسی میں فرہنگ کا لفظ ثقافت یا کلچر اور تعلیم کے معنوں میں بھی آتا ہے) اور اردو لغت بورڈ کی لغت میں بھی فرہنگ کا لفظ ''لغت'' اور ''عقل'' وغیرہ ہی کے معنوں میں درج ہے، لیکن لفظ ''فرہنگ'' کا ایک نیا مفہوم جو اردو میں اب رائج ہے اور کسی اردو لغت میں درج نہیں وہ ہے:

۱۔ الف بائی ترتیب میں مرتب کی گئی ایسے الفاظ کی فہرست مع معنی و تشریح جو کسی خاص موضوع یا مضمون یا متن سے متعلق ہوں، یہ عموماً کتابوں کے آخر میں دی جاتی ہے۔

۲۔ مختصر لغت جو خاص موضوع یا علم و فن کے الفاظ پر مبنی ہو یا جس میں مخصوص ذخیرۂ الفاظ کو شامل کیا گیا ہو۔

اوپر درج کیے گئے پہلے معنی (یعنی فہرست) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو گویا انگریزی میں جسے ''گلوسری'' (glossary) کہا جاتا ہے اسے اردو میں اب فرہنگ کہتے ہیں۔ گلوسری کے لیے فارسی میں مستعمل مترادفات میں سے ایک ''فہرستِ معنی'' بھی ہے اور عربی میں اسے دیگر ناموں کے علاوہ ''قاموسِ مصطلحات'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ عربی اور فارسی کے ان مذکورہ بالا مترادفات سے بھی اردو میں ''فرہنگ'' کے لفظ کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ دوسرے معنی (یعنی مختصر لغت) کے مفہوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزی میں ایسی کتابوں کو کبھی گلوسری کہا جاتا ہے اور کبھی ڈکشنری یا dictionary of technical terms بھی کہا جاتا ہے۔

فرہنگ کا جو مفہوم ہم نے اوپر تحریر کیا ہے اس کے استناد کا سوال ضرور اٹھے گا اور اٹھنا بھی چاہیے۔ تو عرض ہے کہ اردو کی کئی کلاسیکی کتابوں نیز بعض درسی کتب کے آخر میں مشکل الفاظ کی جو فہرست مع معنی درج ہوتی ہے اسے اردو میں فرہنگ ہی کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال کئی کتابوں میں

موجود ہے۔ مثلاً ممتاز حسین نے ''باغ و بہار'' (کراچی: اردو ٹرسٹ، ۱۹۵۸ء) مرتب کر کے اس کے آخر میں مشکل الفاظ اور ان کے معنی کی جو فہرست دی ہے اس پر ''فرہنگ'' ہی کا عنوان درج ہے۔ یہ مختصر لغت ہے جو مخصوص الفاظ پر مبنی ہے۔ نیز رشید حسن خان کی ''کلاسیکی ادب کی فرہنگ'' (دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۲۰۰۳ء) کے نام ہی میں لفظ فرہنگ موجود ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مخصوص ذخیرۂ الفاظ پر مبنی مختصر لغت ہے۔ اس کے علاوہ تکنیکی، فنی اور سائنسی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے مرتب کی گئی کئی اردو لغات کے نام میں بھی لفظ فرہنگ استعمال ہوا ہے، مثلاً صوفی گلزار احمد صاحب کی مرتبہ ''فرہنگِ نفسیات'' لاہور سے ملک دین محمد نے ۱۹۶۱ء میں شائع کی۔ اس میں علم نفسیات کی انگریزی اصطلاحات اور اردو مترادفات مع اردو تشریح درج ہیں۔ جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے کئی علوم و فنون کی فرہنگیں شائع کی ہیں جن میں اصطلاحات مع مفہوم یا مترادفات درج ہیں۔ جامعہ کراچی کی شائع کردہ ان کتابوں میں ایک کتاب ''فرہنگِ اصطلاحاتِ حیاتیات'' کے نام سے ہے جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی اور جس کا انگریزی نام یہ ہے:
A dictionary of technical terms: Biology۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اردو میں اصطلاحات یا تکنیکی یا مخصوص الفاظ کی الف بائی فہرست (مع معنی) کو بھی فرہنگ کہتے ہیں، خواہ وہ ضخیم کتاب کی شکل میں ہو یا چند صفحات پر مبنی الفاظ و معنی کی فہرست ہو۔ اردو کے لغت نویسوں کو چاہیے کہ اب لفظ ''فرہنگ'' کا یہ مفہوم بھی اپنی لغات میں شامل کر لیں۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب اردو میں ''لغت'' اور ''فرہنگ'' کے الفاظ دو مختلف مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں اور ماضی کے برعکس اب ان دونوں میں فرق آ چلا ہے۔ اب اردو میں لفظ ''لغت'' تو ڈکشنری کے معنوں میں ہے اور ''فرہنگ'' گلوسری یا ٹیکنیکل ڈکشنری کے معنوں میں، چاہے عربی اور فارسی میں ''فرہنگ'' اور ''لغت'' کے الفاظ کا مفہوم کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔ اردو زبان اور لغت عربی یا فارسی کی پابند نہیں ہیں۔ اردو والوں نے تصرف کر کے کئی عربی و فارسی الفاظ کا تلفظ اور معنی اور ہجے تک بدل دیے ہیں۔ بقولِ انشاء اللہ خاں انشاء، جو لفظ اردو میں آ گیا اردو کا ہو گیا۔ اب اس کے معنی، تلفظ اور محاورے وغیرہ اردو ہی کے لحاظ سے درست مانے جائیں گے۔ جو حضرات عربی اور فارسی لغت سے لفظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر سید سلیمان ندوی اور محمد حسین

آزاد جیسے اہلِ علم کے تصرفات پر اعتراض کرتے ہیں انھیں اردو زبان کے مزاج سے ذرّہ برابر شناسائی نہیں ہے۔ یہ بزرگ ہم آپ سے کہیں زیادہ عربی اور فارسی جانتے تھے اور اردو کے تو ہم سے کہیں زیادہ بڑے ماہر اور عالم تھے ہی۔

☆فرہنگ خصوصی لغت ہوتی ہے

لغت کی موٹی موٹی قسمیں بیان کی جائیں تو وہ دو ہیں: عمومی اور خصوصی۔

۱۔عمومی لغات (general dictionaries)

عمومی لغات وہ ہوتی ہیں جن میں کسی زبان کے کم و بیش تمام الفاظ یا اس کے ذخیرۂ الفاظ کا خاصا بڑا حصہ عام قاری کے لیے بترتیب حروفِ تہجی مع معنی پیش کیا جاتا ہے[۴]۔

۲۔خصوصی لغات (specialised dictionaries)

خصوصی لغات وہ حوالہ جاتی کتب یا فہرستِ الفاظ ہوتی ہیں جن میں عمومی لغات کے برعکس مخصوص اور محدود دائرے کی معلومات دینے والے الفاظ و مرکبات مع معنی بترتیبِ حروفِ تہجی درج کیے جاتے ہیں[۵]۔ گویا خصوصی لغت سے مراد ایسی لغت ہے جو کسی خاص موضوع یا زبان کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص علم یا فن سے متعلق الفاظ و مرکبات یا اصطلاحات کو مع معنی حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج کرے[۶]۔

خصوصی لغات کئی طرح کی ہو سکتی ہیں اور انھیں اردو میں فرہنگ ہی کہنا چاہیے، مثلاً: تلفظ بتانے والی فرہنگ (جیسے فرہنگِ تلفظ از شان الحق حقی)، مترادفات کی فرہنگ (جیسے قاموسِ مترادفات از وارث سرہندی)، کسی خاص علم یا فن کی فرہنگ (جیسے فرہنگِ اصطلاحاتِ طبیعیات)، کسی شاعر یا ادیب کے ذخیرۂ الفاظ کی فرہنگ (جیسے فرہنگِ اقبال از تسیم امروہوی)، محاورات کی فرہنگ (جیسے ہندوستانی مخزن المحاورات از چرنجی لال)، کہاوتوں کی فرہنگ (جیسے جامع الامثال از وارث سرہندی)، سلینگ الفاظ کی فرہنگ (جیسے اردو سلینگ لغت از قاسم یعقوب نیز راقم کی مرتبہ اولین اردو سلینگ لغت) وغیرہ۔

گویا فرہنگ بھی ایک طرح کی خصوصی لغت ہوتی ہے اور فرہنگ مرتب کرنے والوں کو فرہنگ کی تدوین کے اصولوں کو ذہن میں رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ فرہنگ نویسی کے اصول لغت

نویسی کے اصولوں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں کیونکہ دونوں کا میدان لغت ہوتے ہوئے بھی بہر حال تھوڑا سا مختلف ہوتا ہے۔

☆ادبی متون کی فرہنگیں

ادبی متن کی فرہنگ کو انگریزی میں author dictionary (نیز author's dictionary) یعنی ''مصنف کی فرہنگ'' کہا جاتا ہے ۷۔ ادبی متن کی فرہنگ نویسی انگریزی میں author lexicography یعنی ''مصنف کی لغت نویسی'' کہلاتی ہے ۸۔ انگریزی میں مصنفین کی فرہنگوں یا author dictionaries کا آغاز دراصل لاطینی اور یونانی ادیبوں کی ان فرہنگوں کے اثر سے ہوا جو ''گلوسریل کنکارڈنس'' (glossarial concordance) یعنی ''فرہنگی اشاریۂ الفاظ'' کہلاتی تھیں ۹۔ (یہاں ''فرہنگی'' (glossarial) سے مراد ہے فرہنگ کا یا فرہنگ سے متعلق و منسوب)۔ کنکارڈنس (concordance) یعنی اشاریۂ الفاظِ مصنف، دراصل کسی مصنف کے مکمل ذخیرۂ الفاظ کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اس میں کسی ادیب یا شاعر کے پورے ذخیرۂ الفاظ کو استعمال کی مثالوں اور استعمال کی تعداد کی تفصیل کے ساتھ (یعنی کون سا لفظ کتنی بار اور کہاں کہاں استعمال ہوا ہے) الف بائی ترتیب سے مرتب کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی جملے یا مصرعے جن میں وہ لفظ آیا ہو درج کر دیے جاتے ہیں ۱۰۔ مثلاً علامہ اقبال کے فارسی کلام کا مکمل اشاریہ ساجد اللہ تفہیمی نے ''کشف الالفاظِ اقبال'' کے نام سے مرتب کیا اور غالب کا اشاریہ الفاظ ''اشاریۂ کلامِ غالب'' جمال عبدالواجد نے مرتب کیا ۱۱۔ اب اگر ایک شاعر نے ایک لفظ پچاس مصرعوں میں استعمال کیا ہے تو وہ تمام پچاس مصرعے مع حوالوں کے کنکارڈنس میں درج ہوتے ہیں (لیکن فرہنگ میں ایک ہی مثال کافی ہوتی ہے، ہاں اگر کسی لفظ کے دو معنی ہیں تو دونوں کی الگ الگ مثال دینی ہوگی)۔ اس نوعیت کی اشاریہ سازی کی ابتدا انگریزی میں ہوئی تو انگریزی کے بڑے مصنفین مثلاً جیفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) اور شیکسپئر (William Shakespeare) کے بھی اشاریے بنائے گئے ۱۲۔ گو انگریزی میں اس طرح کے کنکارڈنس اور انگریزی میں مصنف کی فرہنگ بنانے کا آغاز پڑوس کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں خاصی تاخیر سے ہوا لیکن ۱۵۹۸ء میں جیفرے چاسر کی تحریروں میں استعمال کیے گئے نادر اور غیر معروف الفاظ کی ایک وضاحتی فرہنگ

بننے کے بعد انگریزی شعرا اور ادبا کے اشاریے اور فرہنگیں بننے لگیں اور اندازہ ہے کہ انگریزی کے تقریباً اسی (۸۰) شعرا و ادبا کی مختلف نوعیت کی لگ بھگ تین سو (۳۰۰) فرہنگیں اور اشاریے بن چکے ہیں۱۲۔

☆اردو میں ادبی متون کی فرہنگیں

آج کل ہماری جامعات میں مختصر لغات یا مخصوص موضوعات کی لغات پر جو کام ہو رہے ہیں ان سب کو فرہنگ کہا جاتا ہے۔ فرہنگِ میر تو ٹھیک ہے، فرہنگِ نظیر اکبرآبادی بھی درست ہے اور فرہنگِ غزلیاتِ درد بھی درست ہے، لیکن ان سب کاموں کو مجموعی طور پر ''فرہنگوں پر کام'' کی بجائے ''ادبی متون کی فرہنگوں پر کام'' کہنا چاہیے۔ لوگ عام طور پر فرہنگوں اور ادبی متون کی فرہنگوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ ہشام السعید صاحب نے اپنے عمدہ مقالے ''اردو فرہنگ نگاری: تشکیل و تحقیق''۱۳ میں ادبی متون کی فرہنگوں کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا عنوان مطلقاً فرہنگوں کی بات کرتا ہے۔ اگر اس کے عنوان اور مباحث میں ادبی متون کی فرہنگوں کی اصطلاح شامل ہو جاتی تو یہ مفید مضمون زیادہ بامعنی ہو جاتا۔ موجودہ صورت میں اس مقالے میں ابتدا میں تو فرہنگ کا تعارف اور مفہوم بالکل درست دیا گیا ہے (یعنی کسی خاص موضوع کے الفاظ کی لغت) لیکن آگے چل کر مقالہ نگار صرف ادبی متون کی فرہنگوں تک محدود ہو گئے ہیں۔ ادبی متن کی ہر لغت یقیناً فرہنگ ہوتی ہے لیکن ہر فرہنگ ادبی متن کی لغت نہیں ہوتی۔ سائنسی و تکنیکی اصطلاحات کی لغت بھی فرہنگ ہی ہوتی ہے لہٰذا ''ادبی متن کی فرہنگ'' کہنا وضاحت کے لیے ضروری ہے، صرف فرہنگ کہنے سے یہ دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ مقالہ بہت معلوماتی ہے اور اس میں اردو کی ادبی متون کی فرہنگوں کے ضمن میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں، اگرچہ اردو کی اولین ادبی متن کی فرہنگ کے ضمن میں وہ قدیم ترین فرہنگ کی درست نشان دہی نہیں کر سکے ہیں۔

اردو کی ادبی متون کی اولین فرہنگ کا ذکر ڈاکٹر عبدالرشید نے اپنے ایک عمدہ مقالے بعنوان ''متن اساس فرہنگیں: مسائل اور صورت حال'' میں کیا ہے۔ یہ مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے جریدے ''تدریس نامہ'' (شمارہ ا، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء) میں شائع ہوا تھا اور یہ اس موضوع پر اردو میں لکھے گئے معدودے چند اور اولین مقالات میں سے ہے۔ اگرچہ عبدالرشید

صاحب نے ''اولیت'' کا کوئی دعویٰ نہیں کیا لیکن انھوں نے اپنے اس مقالے میں بہت قیمتی معلومات پہلی بار فراہم کی ہیں اور اس اہم موضوع پر بعض اہم اور بنیادی باتیں بھی کی ہیں۔ عبدالرشید صاحب کے مطابق اردو میں ادبی متن کی سب سے پہلی فرہنگ انیسویں صدی کے اواخر میں مرتب کی گئی۔ انھوں نے اس زمانے میں شائع ہونے والی اردو کی متن اساس فرہنگوں کی جو فہرست دی ہے ان میں سے ادبی متون کی چند اولین اور ابتدائی فرہنگیں یہ ہیں:

۱۔ لغاتِ الف لیلہ، از ماسٹر لکھمی چند، اجمیر۔ ۱۸۸۹ء۔

۲۔ لغاتِ چہار درویش، از ماسٹر لکھمی چند، اجمیر ۱۸۸۹ء۔

۳۔ لغاتِ انشا اردو، از ماسٹر لکھمی چند، اجمیر، ۱۸۸۹ء۔

۴۔ پرائمری لغات کی فرہنگ، از مولوی فیروز الدین، سیال کوٹ، ۱۸۹۲ء۔

۵۔ فرہنگ وکلید النصابِ اردو، پیسہ اخبار، لاہور، ۱۸۹۴ء۔

اس کے علاوہ کلاسیکی متون کے بعض مدوِّنین و مرتبین نے کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی دے دی ہے، عبدالرشید صاحب نے ایسی کلاسیکی کتابوں کی فہرست بھی دی ہے جن کے آخر میں فرہنگ شامل ہے۔ ہشام السعید صاحب نے بھی ادبی متون کی فرہنگوں کی ایک طویل فہرست دی ہے اور انھوں نے بڑی محنت سے ان کاموں کی بھی نشان دہی کر دی ہے جو شائع نہیں ہوئے لیکن مختلف جامعات میں ان پر پی ایچ ڈی یا ایم فل یا ایم اے کی سند کے لیے کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ عموماً ایسے جامعاتی مقالے چھپتے نہیں ہیں اور عام قاری کیا محققین کے علم میں بھی کم ہی آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ فہرست بہت مفید ہے اور اس نوجوان محقق کو اس محنت کی داد ملنی چاہیے۔ لیکن ان دو حضرات نے جن کاموں کی نشان دہی کی ہے ان کے علاوہ بھی کچھ کام اس موضوع پر ہوئے ہیں اور دیگر کئی کام جو شائع ہو چکے ہیں ان کی نشان دہی راقم نے اپنی کتاب ''اردو میں لسانی تحقیق و تدوین: گزشتہ چند عشروں میں'' (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء) میں فرہنگوں اور ادبی متون کی فرہنگوں کے باب میں کی ہے۔ یہاں ان سب کا ذکر تحصیلِ حاصل ہوگا لہٰذا اس سے گریز کیا جا رہا ہے۔

☆ ادبی فرہنگ میں لفظ کا اندراج

لغت اور فرہنگ مرتب کرنے والوں کے لیے یہ بہت اہم نکتہ ہے کہ کس لفظ کا اندراج

لغت یا فرہنگ میں ہونا چاہیے اور کس لفظ کا اندراج نہیں ہوسکتا۔لغت یا فرہنگ میں جس لفظ کا اندراج کیا جاتا ہے اسے اصطلاحاً ہیڈ ورڈ (headword) کہتے ہیں۔اردو میں اسے بنیادی اندراج یا مفرد اندراج یا ''راس لفظ'' بھی کہا جاتا ہے۔البتہ اب انگریزی میں لغت کے مفرد یا بنیادی اندراج کو ہیڈ ورڈ(headword) کے علاوہ ایک اور نام بھی دیا جارہا ہے اور وہ ہے''لیما'' (lemma)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لغت نویسوں اور ماہرینِ علم لغت نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ''ہیڈ ورڈ'' کے لفظ سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف ''ورڈ'' (word) یعنی لفظ ہے جبکہ ہیڈ ورڈ لغت میں ایک اندراج ہوتا ہے اور یہ لفظ کے علاوہ محاورات یا مرکبات پر بھی مبنی ہوسکتا ہے۔لفظ لیما(lemma) کے انگریزی میں مختلف لفظی معنی ہیں اور اس کے ایک معنی ''عنوان'' یا ''سُرخی'' یعنی ''ہیڈنگ''(heading) کے ہیں۔البتہ علم لغت اور لغت نویسی میں یہ لفظ اب ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔دراصل بعض اوقات لغت میں کسی مرکب کا بھی اندراج ہوتا ہے اور وہ ایک لفظ یاword نہیں ہوتا بلکہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے لہٰذا اس کو ہیڈ ورڈ (headword) کہنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔چنانچہ اب لغت نویسی اور علم لغت کی جدید اصطلاح میں بنیادی یا مفرد اندراج کے لیے راس لفظ (ہیڈ ورڈ) کی بجائے لیما(lemma) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے[۱۵]۔

یہاں کچھ روشنی اس امر پر بھی ڈال دی جائے کہ کون سا لفظ لغت یا فرہنگ میں درج کیے جانے کا اہل ہوتا ہے۔لغت نویسی کی اصطلاح میں تو اسے اندراج یا ہیڈ ورڈ یا لیما کہتے ہیں لیکن لسانیات میں اس کے لیے ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے لیکسیم (lexeme)۔اردو میں اسے ''لغویہ'' کہا جاسکتا ہے۔لغویہ یا لیکسیم ایسا بامعنی لفظ ہوتا ہے جس کی کوئی تصریف(inflection) نہ ہوئی ہو اور یہ اپنی اصلی یا انفرادی صورت میں ہو۔مثلاً ''لڑکی'' ایک بامعنی لفظ ہے۔اس کی تصریفی(inflectional) صورتیں ''لڑکیاں'' اور ''لڑکیوں'' ہوسکتی ہیں۔لیکن لغت میں صرف ''لڑکی'' ہی کا اندراج بطور ہیڈ ورڈ ہوسکتا ہے کیونکہ ''لڑکیاں'' اور ''لڑکیوں'' بامعنی لفظ ہونے کے باوجود محض ایک لفظ کی تصریفی شکلیں ہیں۔گویا لڑکی تو لیکسیم یا لغویہ ہے لیکن لڑکیاں اور لڑکیوں لغویہ نہیں ہیں اور ان کو لغت میں بطور بنیادی اندراج شامل نہیں کیا جاسکتا[۱۶]۔یہی حال اردو کے

دیگر الفاظ کی جمع اور تصریفی حالتوں کا ہے۔ البتہ بعض عربی یا فارسی الفاظ کی جمع چونکہ مختلف ہوسکتی ہے لہٰذا ان کا اندراج لغت میں کرنا چاہیے، مثلاً لفظ کتاب کی مثال لیجیے۔ لفظ ''کتاب'' لغویہ ہے لیکن ''کتابیں'' لغویہ نہیں ہے۔ اس لیے لفظ کتابیں یا کتابوں کا اندراج لغت میں نہیں ہوگا۔ البتہ لفظ کتاب کی ایک اور جمع یعنی ''کتب'' بھی ہے، چونکہ یہ اردو کے عام قاعدے سے ہٹ کر اور عربی قواعد کے مطابق بنائی گئی جمع ہے لہٰذا اس کا اندراج لغت میں کرنا ہوگا۔

اسی طرح مرکبات اگر کوئی خاص معنی رکھتے ہیں تو ان کا اندراج کرنا ہوگا لیکن عام سے معنی میں مستعمل مرکبات درج لغت نہیں ہوں گے۔ مثلاً ''نوٹ تڑانا'' ایک مرکب ہے۔ اس کا اندراج لغت میں کرنا ہوگا کیونکہ یہ لفظی معنی میں نہیں ہے۔ اس سے مراد نوٹ کو ہتھوڑے سے تڑانا نہیں ہے بلکہ یہ مجازی معنی میں ہے اور اس سے مراد ہے کرنسی نوٹ کو بھنانا، بڑے نوٹ کو چھوٹے نوٹوں یا سکوں میں تبدیل کرانا۔ لیکن ''سر تڑانا'' لغت میں نہیں آئے گا کیونکہ یہ مجازی یا خاص معنی نہیں رکھتا۔ ''سر'' کے معنی ''س'' کی تقطیع میں اور ''تڑانا'' کے معنی ''ت'' کی تقطیع میں درج ہوں گے اور قاری وہاں سے یہ معنی دیکھ سکتا ہے۔ گویا سر تڑانا ''لیکسیم'' یا ''لغویہ'' یا ''لغت'' نہیں ہے، سوائے اس کے کہ کسی شاعر یا ادیب نے سر تڑانا کو مجازی معنوں میں یا محاورتاً استعمال کرلیا ہو۔ البتہ ''سر توڑ کوشش کرنا'' کا اندراج لغت میں کرنا ہوگا کیونکہ یہاں ''سر توڑ'' مرادی اور مجازی معنوں میں ہے۔

اسی طرح اسم خاص یا اسم معرفہ (proper noun) بھی لغت میں درج نہیں ہوتے، ہاں اگر وہ مجازی معنی رکھتے ہیں تو درج ہوں گے۔ مثلاً ہلاکو یا چنگیز خان لغت میں ''بہت ظالم، سفاک'' کے معنوں میں آسکتا ہے۔ حاتم طائی کا اندراج ''بہت سخی، فیاض'' کے مفہوم میں ہوگا۔ یوسف ''بہت حسین'' کے معنی میں لکھا جائے گا۔ البتہ اس طرح کے اسما کے مجازی معنی لکھنے سے پہلے ان کے معروف معنی (مثلاً حاتم طائی: عرب کا ایک شخص جو سخاوت کے لیے مشہور تھا، وغیرہ) مختصراً لکھنا مجبوری ہے۔ مقامات کے ناموں کے ضمن میں یہ ہے کہ اگر ان کے کوئی دوسرے معنی ہیں تو انھیں بھی درج کرنا ہوگا، مثلاً نیشاپور اور تبریز کا اندراج کرنا پڑے گا کیونکہ یہ شہروں کے نام ہونے کے علاوہ موسیقی کی اصطلاح میں راگوں کے نام بھی ہیں۔ ان مثالوں سے ہٹ کر اسم

خاص (افراد یا مقامات) مثلاً دلیپ کمار یا محمد علی کلے اور کراچی یا دہلی کا اندراج عمومی لغات میں نہیں ہوتا۔ ان کا اندراج لغت کی ایک خاص قسم، جسے انسائیکلو پیڈیائی لغت یا دائرۂ معارفی لغت کہنا چاہیے، میں ہوسکتا ہے کیونکہ اس میں اسماے خاص بھی درج ہو سکتے ہیں۔ ادبی متن کی فرہنگوں میں اسماے خاص کا اندراج اس صورت میں ہوگا کہ ان کی وجہ سے ادبی متن کی تفہیم میں مدد ملتی ہو۔ مثال کے طور پر اردو میں (اور فارسی و عربی میں بھی) بعض شہر یا جغرافیائی مقامات اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے معروف ہیں، مثلاً کسی زمانے میں حلب شہر کے بنے ہوئے آئینے اپنی خوبی کے لیے مشہور تھے اور اردو اور فارسی متون میں آئینۂ حلب یا آئینۂ حلبی کا ذکر ملتا ہے۔ ایسے کسی متن کی وضاحت کے لیے حلب کا اندراج فرہنگ میں کرنا مناسب ہوگا جس میں یہ ترکیب استعمال ہوئی ہو۔ اسی طرح فرضی اور داستانی مقامات مثلاً کوہِ قاف یا دیوارِ قہقہہ کا اندراج بھی لغت اور فرہنگ دونوں میں کرنا چاہیے کیونکہ یہ بسا اوقات تشریح طلب استعارے بن جاتے ہیں اور متن کی تفہیم میں ان کی وجہ سے مشکل پیش آسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ''کوہِ قاف کی پری'' سے ''انتہائی حسین عورت'' بھی مراد لی جاسکتی ہے، چنانچہ اس کے مرادی معنی بھی لغت اور فرہنگ دونوں میں درج ہونے چاہییں۔

☆ادبی متن کی فرہنگ نویسی: اصول اور مقاصد

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں حالیہ برسوں میں مرتب کی گئی متون کی بعض فرہنگوں میں درج بہت سے اندراجات ''لغت'' یعنی ''لغویہ'' نہیں ہیں، یعنی ان کا اندراج بطور راس لفظ یا لیما (lemma) نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن بعض فرہنگوں کے مرتبین نے (غالباً ضخامت بڑھانے کے خیال سے) انھیں درج کر دیا ہے اور اپنا اور دوسروں کا محض وقت ضائع کیا ہے۔ مثلاً ایک بہت معروف شاعر کے کلام کی مطبوعہ ضخیم فرہنگ میں عام سے الفاظ کی بھرمار ہے لیکن نادرالوقوع، قلیل الاستعمال اور مختلف و منفرد معنوں میں مستعمل الفاظ و تراکیب کا نام و نشان تک نہیں ملتا (نہ ہی کسی لغت کا حوالہ ملتا ہے)۔ حالانکہ ادبی متن کی فرہنگ مرتب کرنے کا ایک بنیادی مقصد ان نادر اور انوکھے الفاظ اور مرکبات کو ضبطِ تحریر میں لانا ہوتا ہے اور قاری بھی انھی الفاظ کے لیے فرہنگ سے رجوع کرے گا۔ اس فرہنگ اور مولف کا نام ازراہِ پردہ پوشی یہاں نہیں دیا

جارہا، لیکن ایسی مثالیں تو بہت ہیں جن میں فاضل مرتب نے عام سے الفاظ کے معنی متداول لغات سے لے کر درج کردیے ہیں اور نادر الفاظ (جو شاید انھیں "مشکل" لگے ہوں گے) چھوڑ دیے ہیں۔ان فرہنگوں میں عام سے الفاظ کے عام معنی عام لغات سے اٹھا کر ٹانک دیے گئے ہیں۔چلیے چھٹی ہوئی، محنت کیے بغیر ڈگری بھی مل گئی اور کتاب بھی چھپ گئی۔یعنی ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی آیا چوکھا۔

ادبی متن کی فرہنگ کے مرتب کو سوچنا چاہیے کہ اس کام کا مقصد کیا ہے؟ ادبی متن کی فرہنگ کیوں بنائی جاتی ہے؟ اگر عام سے الفاظ اور رائج و معلوم مرکبات ہی لکھنے ہیں تو فرہنگ کی کیا ضرورت ہے؟ قاری ان کے معنی کسی بھی لغت میں دیکھ لے گا اور لغت نویس کو بھی اس کی سیکڑوں اسناد بآسانی دست یاب ہو جائیں گی۔

کسی ادیب یا شاعر کے متن کی فرہنگ مرتب کرنے سے پہلے جن نکات پر غور ضروری ہے ان کا ذکر اولگا کرپووا (Olga Karpova) نے اپنی محولہ بالا کتاب کے دیباچے میں کیا ہے (ص ٦)، ان میں سے کچھ یہ ہیں: ١۔فرہنگ کا دائرۂ کار، ٢۔فرہنگ کے متن کی بنیاد، ٣۔فرہنگ کی قسم اور نوعیت، ٤۔فرہنگ کی ساختِ صغیر، ٥۔قاری کی ضروریات۔

ان سب کی وضاحت ہم اپنے الفاظ میں اور اردو کی مثالوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

١۔فرہنگ کا دائرۂ کار: اس سے مراد یہ ہے کہ فرہنگ میں کیا کیا کچھ شامل ہوگا۔کیا کسی ادیب یا شاعر کی تمام تحریروں سے الفاظ لے کر اس فرہنگ کا حصہ بنائے جائیں گے یا اس ادیب کے مخصوص اور محدود متن کی فرہنگ بنے گی۔مثلاً غالب یا اقبال کے متن کی فرہنگ بنے گی تو طے کرنا ہوگا کہ ان کی تمام تحریریں بشمول فارسی اور اردو تحریریں نیز نثر اور شاعری اس میں شامل ہوگی یا خاص خاص چیزیں ہی لی جائیں گی اور وہ خاص چیزیں یا مخصوص متن کون کون سے ہوں گے (مثلاً صرف اردو نثر یا صرف اردو شاعری)۔ایسی فرہنگوں کے نام یا عنوانات میں بھی یہ وضاحت ضروری ہوتی ہے کہ یہ اس شاعر کے فارسی کلام کی فرہنگ ہے یا اردو کلام کی، اور نثر کی ہے یا نظم کی، یا دونوں کی۔مثلاً فرہنگِ نثرِ حالی، یا فرہنگِ نظمِ حالی (اردو)، وغیرہ۔اسی طرح فرہنگِ نثرِ شان الحق حقی یا فرہنگِ نظمِ شان الحق حقی (یہاں نظم سے مراد صنفِ نظم نہیں ہے بلکہ مراد ہے

شاعری، جس میں نظم، غزل اور دیگر شعری اصناف شامل ہیں)۔صرف فرہنگِ حالی یا صرف فرہنگِ حقی کا مطلب ہوگا کہ اس میں نظم ونثر دونوں سے الفاظ لیے گئے ہیں۔فرہنگِ یوسفی کے تو نام ہی سے ظاہر ہوگا کہ یہ مشاق احمد یوسفی صاحب کی اردو نثر کی فرہنگ ہوگی لہٰذا یہاں وضاحت ضروری نہیں کیونکہ یوسفی صاحب نے شاعری نہیں کی اور فارسی میں بھی کچھ نہیں لکھا۔

۲۔متن کی بنیاد: یعنی مصنف کے متن کے کس ایڈیشن یا نسخے کو بنیاد بنایا جائے گا۔اگر نسخہ ناقص اور غیر معیاری ہے تو فرہنگ بھی ناقص ہی رہے گی۔صحت کے لحاظ سے درست متن اور مستند ترین نسخے کو بنیاد بنانا چاہیے۔ حالیہ برسوں میں اردو میں بعض نو آموز (بلکہ نومولود کہنا چاہیے) محققین کے مرتبہ کئی کلاسیکی متون ناقص بلکہ مضحکہ خیز اغلاط سے پُر ہیں، ان کی بنیاد پر مرتبہ فرہنگ بھی ناقص ہی ہوگی۔ بلکہ بصد معذرت عرض ہے کہ بعض پاکستانی'' کہنہ مشق محققین'' نے تجارتی مقاصد یا بقولِ شخصے'' کمپنی کی مشہوری'' کے لیے جو کلاسیکی متون مرتب کیے ہیں وہ بھی ناقص ہیں۔ مثلاً نذیر احمد دہلوی کے نثری متون کا مجموعہ جو لاہور سے شائع ہوا اور ایک نامور محقق و نقاد نے مرتب کیا اغلاط سے پُر ہے کیونکہ یہ محض پرانے ناقص ایڈیشنوں کی ناقص نقل ہے۔ چنانچہ اغلاط دو آتشہ ہوگئی ہیں۔اسی ناقص کلیات کی بنیاد پر ایک طالب علم نے ایم فل کی سند کے لیے'' فرہنگِ ڈپٹی نذیر احمد'' مرتب کرڈالی۔غلطیوں کی یہ سہ آتشہ پوٹ مقالے کے نگراں کے فہم وفراست پر بھی نالہ کناں ہے(راقم اس مقالے کا ممتحن تھا اور نگراں صاحب آج تک اس عاجز سے ناراض ہیں)۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس کلیات کے نام میں بھی'' ڈپٹی'' کا لفظ شامل ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو والے نذیر احمد کی اس'' ڈپٹی گیری'' کا پیچھا کب چھوڑیں گے ۔کیا مصطفیٰ زیدی کی کلیات کا عنوان '' کلیاتِ ڈپٹی کمشنر مصطفیٰ زیدی'' لکھا جائے گا؟

عرض یہ ہے کہ متن کو بنیاد بنانے کے سلسلے میں خاص احتیاط ضروری ہے۔مثلاً اگر مرزا سودا کے کلام کی فرہنگ بنانی ہے تو ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی'' کلیاتِ سودا'' (مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور) کے متن کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔یہ اردو میں سودا کے کلام کے مستند نسخوں میں سے ایک ہے اور انھوں نے کئی قلمی نسخوں کی مدد سے یہ تدوین کی تھی۔

۳۔فرہنگ کی قسم اور نوعیت: یعنی مجوزہ فرہنگ صرف الفاظ کی فرہنگ ہوگی یا اس میں

محاورات اور مرکبات یا صنائع بدائع وغیرہ بھی شامل ہوں گے۔جن لکھنے والوں کے ہاں محاورات بکثرت ملتے ہیں، مثلاً مولوی نذیر احمد دہلوی، داغ دہلوی اور فرحت اللہ بیگ وغیرہ، ان کی فرہنگ بغیر محاورات کے شمول کے بے معنی ہوگی۔

۴۔فرہنگ کی ساختِ صغیر: لغت یا فرہنگ کی ساختِ صغیر کو انگریزی میں مائیکرو اسٹرکچر (microstructure) کہتے ہیں۔اس سے مراد ہے لغت یا فرہنگ کے اندراجات کی تفصیل اور ان کو پیش کرنے کا انداز، مثلاً یہ تفصیل کہ فرہنگ میں الفاظ کے علاوہ مرکبات شامل ہوں گے یا نہیں، تلفظ اور مختلف معنی دیے جائیں گے یا نہیں اور اگر دیے جائیں گے تو کس طرح، کیا ایک لفظ کے مختلف رائج املے دیے جائیں گے یا نہیں، الفاظ کی قواعدی حیثیت (اسم، فعل وغیرہ) لکھی جائے گی یا نہیں، ماخذ زبان اور اشتقاق کا اندراج ہوگا یا نہیں ۱۷۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اردو کے ادبی متون کی فرہنگ تیار کرنے والے اس طرح کی تفصیلات سے بالعموم بے نیاز ہوتے ہیں اور کام شروع کرنے کے بعد اس طرح کے سوال اٹھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔

۵۔قاری کی ضروریات: فرہنگ کے مرتب کو دیکھنا چاہیے کہ وہ ترتیب و تدوین کا یہ کام کس کے لیے کر رہا ہے۔اگر یہ عام قاری کے لیے ہے تو اس کے تقاضے الگ ہوں گے، اگر یہ کوئی تحقیقی منصوبہ ہے، مثلاً ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سند کے لیے، تو اس کے تقاضے کچھ اور ہوں گے۔ اگر درسی کتاب یا نصاب میں شامل کتاب کی فرہنگ بنائی جا رہی ہے تو طالب علموں کی ضروریات اور استعداد کو مدنظر رکھنا ہوگا۔درسی یا نصابی متون کی فرہنگوں میں تشریح آسان الفاظ میں اور بہت وضاحت سے دینی چاہیے، بعض اوقات اس تشریح کو متن کے سیاق و سباق سے بھی جوڑنا پڑتا ہے۔

ادبی متون کی فرہنگوں کی تدوین کے کئی مقاصد ہوتے ہیں اور اس ضمن میں کئی اصول اور مباحث بھی مدنظر رکھنے چاہییں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

ا۔ادبی متن کی فرہنگ نگاری کا ایک بڑا مقصد کسی شاعر یا نثر نگار کے ہاں مستعمل اہم الفاظ و تراکیب بالخصوص غریب اور نامانوس، نادر الورود، قلیل الاستعمال اور عجیب اور انوکھے الفاظ (جو عام طور پر لغات میں بھی نہیں ملتے یا کم لغات میں ملتے ہیں) کو درج کرنا اور ان کے استعمال کی

مثالوں کو بطور سند محفوظ کرنا ہے۔ لہٰذا فرہنگ نویس کو چاہیے کہ وہ متن سے ان الفاظ و تراکیب کے مثالیہ جملے اور اشعار درج کرتے وقت ان کا باقاعدہ حوالہ دے، کتاب کا نام اور صفحہ نمبر درج کرے اور فہرستِ اسناد و مآخذ میں ان کی مکمل طباعتی و اشاعتی تفصیلات درج کرے، مثلاً ناشر، مقامِ اشاعت (یعنی شہر کا نام)، سالِ اشاعت، ایڈیشن (اول یا دوم وغیرہ)۔

۲۔ ادبی متن کی فرہنگ کا ایک مقصد متن کی تفہیم میں، بالخصوص قدیم متون کی تفہیم میں مدد دینا بھی ہے۔ پرانے متون میں کئی لفظ مختلف مفہوم میں آئے ہیں۔ ان کے مختلف مفاہیم کو سمجھنا اور فرہنگ میں درج کرنا فرہنگ نویس کی بنیادی اور اہم ذمے داری ہے۔ بعض حضرات اور خواتین نے بغیر قدیم لغات دیکھے اپنی مرتبہ فرہنگوں میں موجودہ زمانے میں رائج معنی درج کر دیے ہیں اور یہ معنی ان کا اور قاری دونوں کا منھ چڑاتے نظر آتے ہیں اور ڈگری کے لیے لکھے جانے والے مقالات کی صورت میں ممتحنین کا بھی۔ مثال کے طور پر لفظ ''طلسم'' عام طور پر ''جادو'' کے مفہوم میں آتا ہے۔ لیکن غالب کے اس شعر:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

میں طلسم کا مطلب ''جادو'' فرض کیا جائے تو شعر کا مفہوم نہیں کھلتا۔ دراصل طلسم کا ایک مفہوم ''سانپ'' بھی ہے۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔ گویا ہر لفظ سانپ ہے جو معنی کے خزانے پر بیٹھا ہے اور اسے ہٹائے بغیر آپ معنی کے خزانے تک نہیں پہنچ سکتے (یہ بات مشہور ہے کہ جو خزانہ زمین میں گڑا ہوتا ہے اس کی حفاظت جادو یا طلسم کے زور پر ایک سانپ سے کرائی جاتی ہے تاکہ کوئی اس تک نہ پہنچ سکے)۔ گویا غالب کے اس شعر کی تفہیم میں مثال کے طور پر اسی شعر کو پیش کرنا چاہیے۔ یہ ایک عجیب و غریب شعر ہے جس کے معنی ''طلسم'' کو سمجھے بغیر واضح نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے فرہنگ نویس اپنی ادبی متن کی فرہنگ میں طلسم کا مفہوم 'جادو' درج کر دیں گے، یہ سوچے بغیر کہ اس طرح متن کی تفہیم میں مدد ملنے کی بجائے الجھن پیدا ہو رہی ہے۔

دیکھیے رشید حسن خاں نے ادبی متن کی فرہنگوں میں معنی کے اندراج کے ضمن میں کتنی اہم بات کی ہے:

''ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کچھ ایسے پرانے لفظوں سے شناسائی ہو سکے گی جن کا چلن اب نہیں رہا، یا ان کے معنی بدل گئے ہیں۔ اس طرح یہ اندازہ ہو سکے گا کہ پرانے متنوں میں ایسے لفظوں کی کتنی بڑی تعداد محفوظ ہے جو ہماری تہذیبی سرگزشت کے دھندلے نشانات بن کر رہ گئے ہیں... اس طرح وہ معنوی تفصیلات محفوظ ہو جائیں گی جن سے آگے چل کر کم لوگ واقف ہوں گے''۔[۱۸]

۳۔ ادبی متن کی فرہنگ نگاری کا مقصد کسی ادیب یا شاعر کے ذخیرۂ الفاظ کا صرف ریکارڈ مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا لسانی اور لغوی تجزیہ بھی ضروری ہے کہ کسی اہل قلم کے ہاں کس قسم کے الفاظ اور مرکبات استعمال ہوئے ہیں، کون سے زیادہ اور بتکرار استعمال ہوئے ہیں اور ان کی ممکنہ توجیہات کیا ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اقبال کے اردو کلام میں لفظ ''لالہ'' بار بار آیا ہے، اس کی ممکنہ توجیہ و تشریح بھی ضروری ہے اور اس سے بھی اس لفظ کے مختلف مرادی و مجازی مفاہیم پر روشنی پڑے گی۔

۴۔ ایک اور اہم مقصد ان لفظیات، بالخصوص کلاسیکی متون کی لفظیات، کا سماجی، تاریخی اور تہذیبی تجزیہ کرنا بھی ہے۔ کوئی لفظ کیوں رائج تھا اور کیوں متروک ہو گیا۔ جب کلچر تبدیل ہوتا ہے تو لفظ بھی بدل جاتے ہیں یا ان کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ سماجی اور تہذیبی تجزیے میں اس تاریخی تبدیلی کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ الفاظ اور محاورات کا تہذیبی اور سماجی تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ مثلاً شریف احمد قریشی نے ''فرہنگِ فسانہ آزاد اور اس کا عمرانی، لسانیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے جو ضخیم کام کیا ہے اس میں فرہنگ سازی کے علاوہ تقریباً ساٹھ ستر صفحات میں اس کا تجزیہ بھی کیا ہے (دہلی: عاکف بک ڈپو، ۲۰۰۰ء)۔ اس طرح یہ کام محض الفاظ کی ''کھتونی'' نہیں ہے اور دیگر لحاظ سے بھی مفید ہو گیا ہے۔

۵۔ لسانیات کا مسلمہ اصول ہے کہ زبان بدلتی ہے اور لفظ کے معنی میں بھی فرق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف یا فرق (variation) علاقائی اور جغرافیائی بھی ہوتا ہے اور سماجی اور طبقاتی بھی۔ زبان میں علاقائی اور جغرافیائی فرق علاقائی تحتی بولیوں (regional dialects) کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور طبقاتی اور سماجی فرق عوامی بولی یا عوام کے مختلف

طبقات کی بولیوں یعنی سماجی بولیوں (social dialects) کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ادبی فرہنگ کے مرتب کواس لحاظ سے بھی تجزیہ کرنا چاہیے اور حواشی میں وضاحت کرنی چاہیے کہ کسی لفظ کے معنی میں کس طرح علاقے یا طبقے کے لحاظ سے فرق اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔مثلاً لفظ ''بُوا'' بھوپال کی اردو میں مسلمان خادمہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ یوپی کے ہندو اسے باپ کی بہن کے لیے بولتے ہیں لیکن یوپی میں مسلمان عورتیں برابر والیوں کو بوا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں ۱۹۔ اصطلاحاً اسے فرق یا variation کہنا چاہیے۔اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا، بالخصوص کلاسیکی متون میں، ورنہ متن کی درست تفہیم ناممکن ہوگی بلکہ فرہنگ گمراہ کن ثابت ہوگی۔

مفہوم میں طبقاتی اور سماجی طور پر پیدا ہونے فرق کی ایک مثال لفظ ''سُپاری'' ہے۔یہ لفظ اردو میں چھالیہ کے معنوں میں مستعمل ہے لیکن سلینگ زبان میں اس کا مطلب ہے کرائے کے قاتل کو قتل کی اجرت کی پیشگی جزوی ادائی۔اسی طرح صحیح لفظ ''شہرت'' ہے اور لفظ ''مشہوری'' کا شہرت کے معنوں میں استعمال معیاری زبان میں درست نہیں مانا جاتا لیکن عوامی اور بازاری زبان میں اس کا استعمال ہوتا ہے (جیسے بعض مجمعے باز اتائی اور نیم حکیم خانہ ساز دوا بیچتے وقت کہتے ہیں کہ ''کمپنی کی مشہوری'' کے لیے دوا سستی فروخت کی جارہی ہے)۔مفہوم میں ہونے والی اس قسم کی طبقاتی اور جغرافیائی تبدیلیوں پر بھی فرہنگ نویس کی نظر ہونی چاہیے۔

لسانیات کے اصولوں کے مطابق زبان میں دوسری تبدیلی تاریخی ہوتی ہے اور یہ تبدیلی وقت گزرنے کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے اور اسے لسانیات کی زبان میں تغیر (change) کہا جاتا ہے۔کلاسیکی متون پر چونکہ خاصا وقت گزر چکا ہوتا ہے لہٰذا ان کے الفاظ کے معنی میں تغیر لامحالہ ہوتا ہے۔فرہنگ نویس کو اس پر نظر رکھنی چاہیے۔مثلاً باغ و بہار میں ''رنڈی'' کا لفظ عورت اور عام عورت کے معنی میں آیا ہے۔طوائف کے معنی بعد میں، وقت گزرنے کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔نوطرزِ مرصع میں ''مجرا'' کا لفظ سلام کے معنی میں آیا ہے۔طوائف کے مجرے کا مفہوم بعد میں پیدا ہوا۔اصطلاحاً یہ تاریخی تبدیلی یا تغیر (change) ہے۔

فرہنگ نویس کو فرق (variation) اور تغیر (change) کا خیال رکھنا چاہیے اور متن کے زمانے اور اس کے مصنف کے مخصوص جغرافیائی خطے کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

۶۔ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔لیکن فرہنگ نویس جس لفظ کا اندراج اپنی فرہنگ میں بطور ''لیما'' کرے گا اس کے صرف وہی معنی درج کرے گا جو اس شاعر یا ادیب کے اس جملے یا مصرعے رشعر سے نکل رہے ہیں جسے فرہنگ میں بطورِ سند پیش کیا جا رہا ہے۔مثلاً لفظ ''میدان'' کے سترہ (۱۷) معنی اردو لغت بورڈ کی لغت میں درج ہیں لیکن اگر اقبال کی فرہنگ بناتے ہوئے لفظ ''میدان'' کی سند کے طور پر بانگِ درا میں شامل نظم ''شکوہ'' کا یہ مصرع پیش کیا جا رہا ہے:

ع: پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

تو اس میں میدان کے معنی رزم گاہ یعنی میدانِ جنگ ہیں۔باقی سولہ (۱۶) معنی اس کے ساتھ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔اگر کسی شاعر یا ادیب کے ہاں ایک لفظ دو مختلف معنوں میں آیا ہے تو دونوں کی الگ الگ شقیں بنا کر (مثلاً ایک اور دو، یا الف اور ب) ہر معنی کے ساتھ متعلقہ مفہوم کی سند لکھی جائے گی، یہ نہیں کہ پہلے دونوں معنی لکھ دیے اور پھر دونوں اسناد دے دیں۔ہمارے کچھ ''فاضل'' فرہنگ نویسوں نے ایسا کیا بھی ہے اور قاری سوچتا رہ جاتا ہے کہ کس معنی کی سند کون سا مصرع یا شعر ہے۔گویا فرہنگ میں کسی لفظ کے کئی معنی لکھنے کی بجائے صرف وہ معنی لکھے جائیں گے جو اس لفظ یا ترکیب کی سند میں پیش کیے گئے جملے یا مصرعے سے نکل رہے ہیں لیکن اگر ایک ہی لفظ کی اسناد مختلف معنوں کی ہیں تو باری باری نمبر لگا کر وہ سب معنی اسناد کے ساتھ بالترتیب درج کیے جائیں گے۔مثلاً اقبال کے ہاں لفظ میدان عام معنی میں (یعنی لمبا چوڑا قطعۂ زمیں) بھی آیا ہے اور رزم گاہ کے معنی میں بھی۔اب اگر اقبال کے اردو کلام کی فرہنگ بنائی جائے تو اس میں میدان کے معنی نمبر ایک لکھے جائیں گے (یعنی زمین کا وسیع و عریض ٹکڑا) اور اس کی سند میں بانگ درا میں شامل نظم ''محبت'' کا یہ مصرع لکھا جائے گا:

ع: پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں

اس کے بعد میدان کے معنی نمبر دو لکھے جائیں گے (یعنی میدانِ جنگ یا رزم گاہ) اور اس کی سند میں نظم ''شکوہ'' کا وہ مصرع لکھا جائے گا جو اوپر رزم گاہ کے معنی میں درج کیا گیا ہے،یعنی پاؤں شیروں کے بھی۔۔۔ الخ۔

۷۔ ہر شاعرانہ ترکیب یا استعارہ لغت نہیں ہوتا یعنی لغت یا فرہنگ میں با معنی اور تشریح طلب لفظ کے طور پر ہر استعارہ بطور لیما درج نہیں ہو سکتا۔ اکثر شاعر لفظوں میں مختلف قسم کے شعری پیکر تراشتے ہیں جسے انگریزی میں امیجری (imagery) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شاعر نئی تشبیہات بھی گھڑتے ہیں۔ لیکن ہر نو آموز شاعر کی ہر امیجری اور ہر تشبیہ فوراً ہی لغت میں درج ہونے کا اعزاز نہیں پا سکتی تا قتیکہ اس کا استعمال اوروں کے ہاں بھی نہ ہو۔ ہاں البتہ بڑا شاعر زبان بناتا ہے۔ بڑے اور عالم شاعر کی زبان سند مانی جا سکتی ہے۔

۸۔ محاورے اور ضرب المثل (یعنی کہاوت) کے الفاظ میں تصرف جائز نہیں، لیکن شاعری میں وزن یا دیگر وجوہ کی بنا پر بسا اوقات شعرا محاوروں کے الفاظ کی ترتیب بدل دیتے ہیں۔ یہ شعرا کے لیے جائز ہے۔ لیکن فرہنگ میں ان کا اندراج کرتے ہوئے محاورے کے الفاظ کی ترتیب کو درست کر دیا جائے گا۔ مثال کے طور غالب کا مصرع ہے:

ع: صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا

محاورہ جوے شیر لانا یا جوے شیر کا لانا ہے۔ لہٰذا جب فرہنگ میں اس کا اندراج ہوگا تو حرف لام کی تقطیع میں ''لانا جوے شیر کا'' کی صورت میں نہیں ہوگا بلکہ جیم کی تقطیع میں ''جوے شیر کا لانا'' کی صورت میں ہوگا اور سند میں یہی مصرع لکھا جائے گا (مع حوالہ ٔ نسخہ وصفحہ نمبر)

۹۔ بعض شعرا خصوصاً کلاسیکی شعرا کے ہاں بعض علوم وفنون کی اصطلاحات کثرت سے ہیں جن سے آج کا عام طالب علم واقف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حکیم مومن خاں مومن کے قصیدوں میں نجوم اور طب کی اصطلاحات بکثرت ہیں (مومن طب اور نجوم دونوں سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے)، جس شخص کو ان علوم کی اصطلاحات سے اچھی خاصی آگہی نہ ہو اسے مومن کے قصائد کی مفصل فرہنگ کیا مختصر سی فہرست بھی بنانے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طالب علموں کو فرہنگ کا کام بطور مقالہ تفویض کرتے ہوئے ان کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کو بھی مدنظر رکھیں۔

۱۰۔ لغت میں معنی کے اندراج کے لیے مستند لغات سے مدد لینی چاہیے اور فہرست ِ مآخذ میں ان کے نام اور طباعتی تفصیلات ضرور دینی چاہییں ورنہ یہ ایک طرح سے سرقہ بھی کہلا سکتا ہے

(فہرستِ مآخذ سے مراد فہرستِ اسنادِ محولہ ہے جسے کتابیات یا ببلیو گرافی (bibliography) بھی کہا جاتا تھا اور بعض صورتوں میں اب بھی کہا جاتا ہے)۔

۱۱۔ اسی طرح اسناد لکھنے کے بعد کتاب کا نام اور صفحہ نمبر (جس سے وہ اسناد لی گئی ہیں) ضرور لکھنا چاہیے اور ان کتابوں/دواوین کی طباعتی تفصیلات مع ایڈیشن کے اور مصنف (اور مرتب اگر کوئی ہو) کے نام کے ساتھ ضرور فہرستِ مآخذ میں لکھنا چاہیے۔

۱۲۔ بعض طالب علم فرہنگ بنانے کا کام عام سی کاپیوں یا رجسٹروں پر شروع کر دیتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے ہیں کیونکہ قدم قدم پر نئے الفاظ کا اضافہ فہرست میں ہوتا ہے اور نئے اندراجات کی الف بائی ترتیب میں اضافے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں کاغذ کے بڑے ٹکڑوں یا کارڈوں کا استعمال صحیح رہتا ہے۔ لائبریری کے کیٹلاگ میں استعمال ہونے والے یا اس سے ذرا بڑے کارڈ استعمال کرنے چاہییں۔ لیکن بسا اوقات کارڈوں کی ضخامت کی وجہ سے انھیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر اے فور (A4) کی پیمائش کے کاغذ کو چوڑائی میں دو برابر حصوں میں کاٹ لیا جائے تو اس میں خاصی گنجائش ہوتی ہے اور لفظ، اس کا تلفظ، قواعدی حیثیت، مختلف معنوں کی شقیں اور ان کی اسناد ایک ہی کاغذ میں سما جاتی ہیں۔ ان کاغذات کو الف بائی ترتیب میں مرتب کرنا اور ان کے درمیان نئے کارڈ/کاغذ کے ذریعے نئے اندراجات کا اضافہ کرنا آسان رہتا ہے۔

۱۳۔ اندراجات کے کارڈ بنانے کے بعد ان کو حروف کار یعنی کمپوزر کو دینے سے قبل الف بائی ترتیب میں رکھ کر ان پر شمار کا عدد لکھ لینا چاہیے۔ پھر انھیں ایک کوتے سے جلد ساز کی طرح مضبوط دھاگے میں پرو لینا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر کمپوزر کی غفلت یا کسی اور وجہ سے کوئی کاغذ گم بھی ہو جائے تو شمار کے عدد سے گم شدگی کا علم ہو جائے گا۔

۱۴۔ ان کاغذوں یا کارڈوں کی ایک نقل، خواہ ہاتھ سے لکھی ہوئی خواہ عکسی نقل (یعنی فوٹو کاپی) کی صورت میں، اپنے پاس رکھنی چاہیے تاکہ خدانخواستہ کسی حادثاتی صورت حال کے نتیجے میں ساری محنت اکارت نہ ہو جائے۔

۱۵۔ فرہنگ نویس کو عام سے اور ہر لغت میں مل جانے والے الفاظ اور مرکبات درج

کرنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ یہ کام لا حاصل ہے۔کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نادر، عجیب و غریب ، انوکھے، متروک، شاذ، قلیل الورود اور قلیل الاستعمال الفاظ و مرکبات، اصطلاحات، محاورات، کہاوتیں وغیرہ مع اسناد پیش کی جائیں۔اس کے علاوہ متروک معنی یا مجازی معنی یا ایسے معنی جو کم ہی لغات میں درج ہیں بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ اردو لغت اور اردو زبان کو ثروت مند بنانے کا عمل ہے۔

بعض بڑی اردو لغات میں بعض معنی بغیر کسی سند کے درج کر دیے گئے ہیں حالانکہ لغت نویسی میں سند شرط ہے(اردو لغت بورڈ نے محض دیگر لغات کا حوالہ دے کر سیکڑوں الفاظ کے معنی لکھ دیے ہیں۔ یہ نقل در نقل ہے جو اردو لغات کی عام بیماری ہے)، ایسے الفاظ کے استعمال کی سند اگر فرہنگ میں دے دی جائے تو یہ بھی اردو لغت میں اہم اضافہ تصور کیا جائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ اردو لغت بورڈ کی لغت کی تدوینِ نو کے وقت ادبی متون کی ایسی تمام فرہنگوں کا مطالعہ لازمی ہوگا جو نئے، نادر اور غریب الفاظ ،متروک معنی اور ان کی اسناد مہیا کر سکیں ۔ یہ کام ہمارے نوجوان محققین کو ضرور کرنا چاہیے۔

استعمال کی سند کی اہمیت یہ ہے کہ لفظ کے معنی استعمال ہی سے طے ہوتے ہیں۔ دراصل شاعر اور ادیب ہی زبان میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کی تحریروں میں بسا اوقات نئی تراکیب یا پرانے الفاظ کے نئے معنی ملتے ہیں جو وقت کے ساتھ رائج بھی ہو جاتے ہیں ۔شعرا اور ادبا کا نادر اور قلیل الاستعمال الفاظ یا تراکیب کا اپنی تحریر میں استعمال کرنا یا شاذ معنوں میں ان کو برتنا دراصل لغت نویس کے لیے بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ لغت میں کسی لفظ یا اس کے مفہوم کے اندراج کے لیے سند درکار ہوتی ہے اور یہ سند جملے یا مصرعے میں لفظ کے استعمال ہی کی صورت میں ہوتی ہے۔اس طرح مختلف طرح کے متون (ادبی و غیر ادبی دونوں طرح کے) سے الفاظ اور ان کے معنی اخذ کر کے لغت مرتب کی جاتی ہے۔

امید ہے ہمارے فرہنگ نویس محض ڈگری کے لیے یہ کام نہیں کریں گے بلکہ ہماری خوب صورت اور باثروت زبان کو مزید خوب صورت اور ثروت مند بنانے کے جذبے سے فرہنگ نویسی کی ذمے داری اٹھائیں گے۔

حواشی:

۱۔مثلاً آر آر کے ہارٹ مین اور گریگری جیمز (R.R.K. Hartmann and GregoryJames)، کی کتاب Dictionary of Lexicography (لندن: روٹلج، ۱۹۸۸ء) نیز بی ٹی اٹکنس اور مائیکل رنڈل (B.T. Atkins and Michael Rundell) کی کتاب The Oxford Guide to Practical Lexicography (اوکسفرڈ: ۲۰۰۸ء) (ص ۳۵۔۱۷) میں بھی یہی تعریف کچھ الفاظ کے فرق کے ساتھ ملتی ہے۔ Concise Oxford Englsih Dictionary نے بھی کم وبیش یہی لکھا ہے، ملاحظہ ہو اس کا گیارھواں ایڈیشن، ۲۰۰۶ء۔

۲۔یہ معنی بھی کئی فارسی لغات میں درج ہیں، مثلاً: فرہنگ جامع: فارسی بہ انگلیسی و اردو (اسلام آباد: رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، ۲۰۰۳ء)، اشاعتِ ثانی۔

۳۔مختلف لغات میں یہ مفاہیم موجود ہیں، مثلاً المنجد (عربی۔اردو)، (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۷۵ء)۔

۴۔تفصیلات کے لیے: آر آر کے ہارٹ مین اور گریگری جیمز، محولہ بالا، ص ۶۱؛ نیز بی ٹی اٹکنس اور مائیکل رنڈل، محولہ بالا، ص ۳۵۔۱۷

۵۔آر آر کے ہارٹ مین اور گریگری جیمز، محولہ بالا۔

۶۔تفصیلات کے لیے: ہارٹ مین، محولہ بالا؛ نیز سڈنی آئی لینڈو (Sydney I. Landau) Dictioanries: The Art and Craft of Lexicography (نیو یارک: چارلس اسکربنرز، ۱۹۸۴ء)، ص ۲۲۔۲۰؛ گیان چند جین، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۵۶۱۔ ۵۵۶؛ رؤف پاریکھ، علم لغت، اصول لغت اور لغات (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۴۸۔۴۷

۷۔ہارٹ مین اور گریگری جیمز، محولہ بالا۔

۸۔ایضاً۔

۹۔اولگا کرپووا، (Olga Karpova) ، English Author Dictionaries (ناٹین، کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۱۱ء)، ص ۶۔۵۔

۱۰۔رؤف پاریکھ، اردو میں لسانی تحقیق و تدوین: گزشتہ چند عشروں میں، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۶۹۔۶۸

۱۱۔ایضاً۔

۱۲۔ہارٹ مین اور گریگری جیمز، محولہ بالا۔

۱۳۔ اولگا کرپووا، محولہ بالا، ص ۷۔۶

۱۴۔ مشمولہ تحقیق، شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، شمارہ ۳۱، جنوری۔ جون ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۱۔۱۵۴

۱۵۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: بو سونسن (Bo Sveneson) کی کتاب A Handbook of Lexicography (کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)، بالخصوص پانچواں باب۔ نیز ایم اے کے ہالی ڈے و دیگر (M.A.K. Halliday and others)، Lexicology and Corpus Linguistics، (لندن: کنٹی نیم، ۲۰۰۴ء)، ص ۶؛ اس کے علاوہ راقم کی کتاب علم لغت، اصول لغت اور لغات، محولۂ بالا، (ص ۱۸۔۱۷) میں بھی اس موضوع پر کچھ معلومات اور دیگر حوالہ جات درج ہیں۔

۱۶۔ رؤف پاریکھ، علم لغت، اصول لغت اور لغات، محولہ بالا، ص ۱۶۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۱۸۔ رشید حسن خان، کلاسیکی ادب کی فرہنگ (جلد اول)، (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۳ء) ص ۱۲۔

۱۹۔ گیان چند جین، لسانی مطالعے (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۱ء) ص ۱۶۶ (تیسرا ایڈیشن)۔

ماخذ:

۱۔ اٹکنس، بی ٹی اور رنڈل، مائیکل (Atkins, B.T. and Rundell, Michael)، The Oxford Guide to Practical Lexicography، اوکسفرڈ: ۲۰۰۸ء۔

۲۔ پاریکھ، رؤف، اردو میں لسانی تحقیق و تدوین: گزشتہ چند عشروں میں، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء۔

۳۔ پاریکھ، رؤف، علم لغت، اصول لغت اور لغات، کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء۔

۴۔ جین، گیان چند، عام لسانیات، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء۔

۵۔ جین، گیان چند، لسانی مطالعے، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۱ء [تیسرا ایڈیشن]

۶۔ خان، رشید حسن، کلاسیکی ادب کی فرہنگ (جلد اول)، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۳ء۔

۷۔ سونسن، بو (Sveneson, Bo) A Handbook of Lexicography (کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء

۸۔ کرپووا، اولگا، (Karpova, Olga)، Englsih Author Dictionaries، ٹائین، کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۱۱ء۔

۹۔لینڈو،سڈنی آئی (Landau, Sydney I.)، Dictioanries: The Art and Craft of Lexicography ، نیویارک: چارلس اسکر بنرز،۱۹۸۴ء۔

۱۰۔ہارٹ مین، آرآر کے اور جیمز، گریگری (Hartmann, R.R.K and James, Gregory)، Dictionary of lexicography،لندن: روٹلج،۱۹۸۸ء۔

۱۱۔ہالی ڈے،ایم اے کے دوگیر (Halliday, M.A.K. et al.)، Lexicology and Corpus Linguistics،لندن: کنٹی نیم،۲۰۰۴ء۔

۱۲۔ہشام السعید،اردو فرہنگ نگاری: تشکیل و تحقیق، مشمولہ تحقیق،شعبۂ اردو،سندھ یونی ورسٹی،جام شورو،شمارہ ۳۱،جنوری۔جون۲۰۱۶ء،ص ۱۷۱۔۱۵۴

امیر مینائی کی ایک نادر اور غیر مطبوعہ لغت

منشی امیر احمد امیر مینائی (۱۹۰۰ء۔۱۸۲۹ء) نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے اور دونوں زبانوں میں نثر بھی لکھی۔ کئی علوم پر حاوی تھے۔ ان کی حیات و خدمات نیز صحیح تاریخِ پیدائش کے موضوع پر کئی منابع و مصادر میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے[1]، لہٰذا تحصیلِ حاصل سے بچتے ہوئے آمدم برسرِ مطلب۔

سرِ دست امیر مینائی کی ایک غیر مطبوعہ لغت ''فرہنگ محاورات اردو'' کا تعارف اور نمونے کے کچھ صفحات پیش کرنا مقصود ہے۔ یہ ایک اردو بہ اردو لغت ہے اور اس میں اردو کے الفاظ و تراکیب، محاورات اور ضرب الامثال مع معنی و اسناد درج ہیں۔ امیر مینائی کے پوتے جناب اسرائیل احمد مینائی کے پاس امیر مینائی کے جملہ قلمی آثار محفوظ ہیں[2] اور اُن کی کرم گستری کے سبب ہمیں اس لغت کے قلمی نسخے کو دیکھنے اور اس سے استفادے کا موقع ملا۔ چنانچہ اُنھیں کے شکریے کے ساتھ یہ تعارف اور نمونے کے صفحات نذرِ قارئین ہیں۔

''فرہنگِ محاورات اردو'' مؤلفہ، امیر مینائی کے واحد معلومہ قلمی نسخے کے کل سات سو تین (۷۰۳) صفحات ہیں اور اس کے مسطر کا ناپ پانچ (۵) انچ ضرب نو (۹) انچ ہے۔ اس میں کوئی تعارف یا مقدمہ وغیرہ نہیں ہے۔ لغت کے پہلے صفحے ہی سے نسخے کا آغاز ہوتا ہے جس کی پیشانی پر ''باب الف ممدودہ'' درج ہے۔ کوئی ترقیمہ یا قطعۂ تاریخِ تصنیف وغیرہ بھی نہیں ہے۔ البتہ آخری اندراج کے بعد ''تمام شد'' لکھا ہے اور اس کے بعد تاریخ پڑی ہے جو یکم مارچ ۱۸۹۸ء ہے۔

ابتدا میں لغت کا نام بھی نہیں لکھا۔ کوئی سرورق یا لوح وغیرہ بھی نہیں ہے لیکن کسی نے بعد میں بطور یادداشت ''فرہنگِ محاوراتِ اردو'' لکھ دیا ہے۔ چونکہ یہ قلمی نسخہ امیر مینائی کے دیگر آثارِ قلمی کے ساتھ ادریس احمد المتخلص بہ خالد مینائی (پسر محمد احمد صریر مینائی)، جو اسرائیل احمد مینائی کے برادرِ بزرگ اور امیر مینائی کے پوتے تھے، کی تحویل میں رہا ہے لہٰذا گمانِ غالب ہے کہ جس طرح

دیگر قلمی آثار پر ان کی بعض یادداشتیں یا وضاحتیں (ان قلمی نسخوں سے متعلق) درج ہیں، اسی طرح یہ نام بھی خالد مینائی صاحب نے لکھا ہوگا اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے اس نام کی روایت بھی یقیناً سنی ہوگی۔

نسخے میں سرخ اور سیاہ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ بنیادی اندراجات یا لیما (lemma) یعنی راس الفاظ (headwords) سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور تشریح/معنی اور سند کے اشعار سیاہ روشنائی میں ہیں۔ ہر حرف کی تقطیع کا آغاز عنوان سے ہوتا ہے مثلاً باب الف مقصورہ، باب بائے موحدہ وغیرہ اور یہ بھی سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔

ہر صفحے پر پندرہ (۱۵) سطریں ہیں لیکن کوئی کالم نہیں بنایا گیا۔ کتابت نستعلیق ہے لیکن خط پختہ یا بہت جما ہوا نہیں ہے اور کسی باقاعدہ کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ نسخہ اچھی حالت میں ہے اور جلد بندی کے باعث محفوظ بھی رہا ہے۔ لیکن کاغذ بھربھرا ہو گیا ہے اور صفحات پلٹنے پر کاغذ کے ٹوٹ جانے کا خدشہ رہتا ہے۔

نسخے کے صفحات جیسا کہ عرض کیا گیا سات سو تین (۷۰۳) ہیں لیکن ان پر شمار کا عدد درج نہیں ہے۔ اسی لیے اکثر صفحات پر ترک کا اہتمام ہے یعنی (جیسا کہ بالعموم قلمی نسخوں میں ہوتا ہے) صفحے کے نچلے بائیں کونے پر اگلے صفحے کا پہلا لفظ لکھا ہے۔ لیکن کچھ صفحات یہ اہتمام نہیں ہو سکا ہے، مثلاً صفحہ اکتالیس (۴۱) سے چون (۵۴) تک ترک نہیں ملتا۔ بعض دیگر صفحات بھی ایسے ہیں۔ البتہ صفحات بظاہر تسلسل میں ہیں اور نسخہ مکمل ہے۔

اس لغت کے اندراجات میں الفاظ، محاورات، فقرات، تراکیب اور کہاوتیں شامل ہیں حالانکہ اس کے نام سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں صرف محاورات ہوں گے۔ لیکن اس میں نہ صرف ''آپ بیتی'' جیسے مرکبات موجود ہیں بلکہ مفرد اندراجات مثلاً اناڑی، اڑی، پچیسی، ڈھانچا، لاج، ہنکارا اور ہنہنانا وغیرہ بھی ملتے ہیں۔

پہلا اندراج ''آپ بیتی'' کا ہے اور آخری اندراج ''یہ کیا زبان نکالی ہے'' کا ہے۔ ہر صفحے پر اندراجات کی تعداد، اسناد زیادہ ہونے کی وجہ سے تین یا چار ہی ہے۔ بعض صفحات پر اندراجات زیادہ بھی آ گئے ہیں اور آٹھ دس تک بھی ہیں۔ اگر اوسطاً فی صفحہ پانچ اندراجات فرض کیے جائیں تو ان کی تعداد تقریباً ساڑھے تین ہزار (۳،۵۰۰) بنتی ہے۔

امیر مینائی نے لغت میں ترتیبِ اندراج میں الف بائی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے لیکن اس اصول

کی پابندی نہیں کی جس کے تحت پہلے بنیادی اندراج یا راس لفظ (headword) کو درج کیا جاتا ہے اور پھر اس کے ذیلی یا تحتی مرکبات لکھے جاتے ہیں، بلکہ امیر نے صرف الف بائی ترتیب کو مدِ نظر رکھا ہے لیکن چونکہ لغت میں مفرد اندراجات کم ہیں اور بالعموم مرکبات و محاورات ہیں لہٰذا یہ عیب اتنا کھلتا نہیں ہے۔

تقریباً ہر تشریح سے پہلے لفظ ''یعنی'' لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ امیر اس سے قبل اپنی معروف لغت ''امیر اللغات'' کی تین جلدیں مرتب کر چکے تھے بلکہ ان کی زندگی ہی میں اس کی دو جلدیں چھپ چکی تھیں اور ان میں تشریح سے پہلے ''یعنی'' نہیں لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ محاوراتِ اردو کے اندراجات کی تشریح میں امیر نے کچھ زیادہ تفصیل نہیں دی۔ بعض جگہ تشریح تشنہ ہے۔ کہیں کہیں تشریح میں غیر ضروری وضاحت سے کام لیا ہے اور ایسے موقعے پر تعقیدِ لفظی بھی نظر آتی ہے مثلاً ''آرسی مصحف دکھلایا'' کی تشریح میں (جو اگلے صفحات پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے)۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ امیر جیسے کہنہ مشق لغت نویس نے محاورات کے اندراجات میں مصدر کے بجائے فعل ماضی یا فعل حال استعمال کیا ہے، مثال کے طور پر ''انگاروں پر لوٹے اور لوٹایا'' کے اندراج کو لیجیے۔ اس سے قطع نظر کہ فعل لازم (لوٹنا) اور فعل متعدی (لوٹانا) کا اندراج ایک ساتھ نہیں ہوتا اور لغت میں ایسے موقعے پر دو الگ الگ اندراج قائم کیے جاتے ہیں، یہاں مصدر یعنی ''انگاروں پر لوٹنا'' اور ''لوٹانا'' کے بجائے فعلِ ماضی لایا گیا ہے ''یعنی انگاروں پر لوٹے یا ''لوٹایا''۔ یہ کسی ایک جگہ نہیں بلکہ اکثر اندراجات اسی طرح مصدر کے بجائے فعل ماضی میں یا حال میں ملتے ہیں۔ جیسے ''انگڑائی لینا'' کے بجائے ''انگڑائی لی''، ''آج کل آرے بلے کرنا'' کے بجائے ''آج کل آرے بلے کرتے ہیں'' اور ''زبان پر سر دینا'' کی بجائے ''زبان پر سر دیتے ہیں'' لکھا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کئی اندراجات میں مصدر ہی ملتا ہے جیسے: آنکھیں چرانا، پانی پی پی کے کوسنا اور منہ لگانا وغیرہ۔ لیکن یہ دو رنگی عجیب ہے اور امیر مینائی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ البتہ کہاوتوں کے اندراج میں ظاہر ہے کہ مصدر نہیں ہوتا اور اس کا خیال رکھا گیا ہے، مثلاً پرائی آنکھیں کام نہیں آتیں، کولھو کے بیل کو گھر میں منزل ہے اور ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہیں اور کھانے کے اور۔

کہیں کہیں تشریح میں پرانے انداز کی جھلک ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک اندراج لفظ ''بانکپن'' کا ہے اور اس کی تشریح میں قدیم لغات کے انداز میں یہ لکھنا کافی سمجھا گیا کہ ''مشہور معنی

ہیں"۔اس کے بعد اسناد دے دی ہیں۔ایسی بے قاعدگی امیر مینائی سے سرزد ہونا تعجب خیز ہے کیونکہ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو میں باقاعدہ سائنٹفک انداز کی لغت نویسی کا آغاز کرنے والوں میں امیر مینائی بھی شامل ہیں۔پرانی لغات میں چاہے وہ اردو کی ہوں یا فارسی کی، کہیں کہیں اسی طرح عام مستعمل الفاظ کو"معروف است"،"یا"مشہور ہے" کہہ کر تشریح نگاری سے مستثنیٰ کردیا جاتا تھا۔ظاہر ہے کہ جدید لغت نویس کے نزدیک یہ مضحکہ خیز ہے کیونکہ لغت میں ہر لفظ کا اندراج ہونا چاہیے چاہے وہ معروف و معلوم ہو یا مجہول و غریب اور بالفرضِ محال لغت نویس صرف غریب اور نادرالوقوع الفاظ ہی کے اندراج کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر اس لفظ کے اندراج کی ضرورت ہی کیا ہے جو بقول اس کے"مشہور" ہے۔

امیر نے فرہنگِ محاوراتِ اردو میں کہیں بھی کسی اندراج کی قواعدی حیثیت واضح نہیں کی۔ اس لغت میں محاورات کے علاوہ کہاوتیں، مقولے، فقرے، مرکبات اور بعض مفرد الفاظ بھی درج ہیں۔ضروری تھا کہ ان کی وضاحت کی جاتی۔

اصولاً محاورات کی لغت میں تلفظ تو درکار نہیں تھا لیکن جب مفرد اندراجات دے دیے تو ان کا تلفظ بھی واضح کرنا چاہیے تھا جو نہیں کیا گیا۔

نسخے میں استعمال کیا گیا املا خاصا قدیم ہے، مثلاً یاے معروف اور یاے مجہول میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا اور بالعموم ہر جگہ یاے معروف ہی لکھی گئی ہے۔غنے کا بھی کوئی تصور نہیں ہے اور ہر جگہ نون بالاعلان ہی ملتا ہے۔اسی طرح ہاے مخلوط (ہاے دوچشمی) کا کوئی تصور نہیں ہے۔ہاے مخلوط والے تمام الفاظ ہاے ہوز یا ہاے مختفی سے لکھے گئے ہیں، مثلاً کچھ کو کچہ، ڈھال کو ڈہال، آنکھوں/آنکھ کو آنکہوں/آنکہ لکھا گیا ہے۔اس املے کی وجہ سے بعض اوقات غلط قرأت کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔طرزِ املا کی وضاحت کے لیے قلمی نسخے کے دو اندراجات پیش ہیں۔"آپ بیتی" کی سند کے طور پر دیا گیا شعر:

جان صدقے اس پری کے جس نے انشا سے کہا
آپ بیتی کہہ کہانی کچھ کسی کی مت چلا

کو کاتب نے یوں لکھا ہے:

جان صدقی اس پری کی جسنی انشا سے کہا
آپ بیتی کہہ کہانی کچہ کسیکی کی مت چلا

ایک اندراج یوں ہے: آنکھوں کو رو بیٹھنا: آنکھوں سے نا اُمید ہو جانا۔ اس کو کاتب نے یوں لکھا ہے: آنکھو نکو رو بیٹھنا: آنکھونسی نا امید ہو جانا۔ حالانکہ اس سے قبل امیر اللغات کی دو جلدیں چھپ چکی تھیں، امیر مینائی زبان کے استعمال اور املا کے معاملے میں بہت حساس اور احتیاط پسند تھے۔ امیر اللغات کی تیسری جلد کا قلمی نسخہ بھی ہمیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کا سالِ کتابت ۱۸۹۵ء ہے اور نظرِ ثانی میں ۱۸۹۸ء بھی نظر آتا ہے۔ اُس میں لفظوں کو ملا کر تو لکھا گیا ہے لیکن یائے معروف و مجہول اور ہائے مخلوط و مختفی میں امتیاز روا رکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں غنے کو بطور نون بالاعلان لکھا گیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کی کتابت ہر لحاظ سے زیرِ نظر نسخے سے بہتر ہے، گو یہ بھی اسی زمانے کا لکھوایا ہوا ہے۔

زیرِ نظر قلمی نسخے میں بھی لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے لیکن یہاں ہائے مخلوط اور یائے مجہول کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں لفظوں کی شکل عجیب سی ہو گئی ہے اور پڑھنے میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔

خیال آتا ہے کہ شاید امیر کو اس پر نظرِ ثانی کا موقع (اپنی علالت اور مصروفیت کے سبب) نہیں مل سکا، لیکن کسی نے صفحہ نوے (۹۰) پر الف کی تقطیع ختم ہونے پر ''صحیح البیاض'' لکھ دیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ بیاض سے نقل کر کے ملا لیا گیا ہے اور گویا صحیح نقل کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں وہی بات کہنی پڑتی ہے جو طرزِ املا اور رسم الخط کی بحث میں کہی جاتی ہے (یا کہی جانی چاہیے) کہ یہ املا کاتب کا ہے، مولف کا نہیں ہے۔ خدا جانے امیر نے اپنی بیاض میں کسی لفظ کا املا کس طرح کیا ہوگا اور کاتب نے اپنی دانست میں اسے کس طرح ''صحیح'' لکھا ہوگا۔ جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ فلاں لفظ کا املا مثلاً ولی دکنی نے یا میر نے یوں کیا ہے ان کی خدمت میں ہم یہی عرض کرتے ہیں کہ حضرت! میر نے نہیں کاتب نے اس کا املا یوں کیا ہے۔ جب تک قلمی نسخہ بخطِ مصنف سامنے نہ ہو اس طرح کے فیصلے صادر نہیں کرنے چاہییں۔ زیرِ نظر نسخہ بھی امیر کا دست نوشتہ معلوم نہیں ہوتا ورنہ اس طرح کے املے کی امیر مینائی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

امیر اللغات کی جلدوں کا اس لغت سے موازنہ کرتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ ایک ہی شخص کی تالیف ہیں۔ اس نسخے کا سالِ کتابت ۱۸۹۸ء ہے اور ۱۹۰۰ء میں امیر کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ امیر کو بوجہ علالت، مصروفیت، سفر اور ضعیف العمری اس پر نظر ڈالنے کا موقع نہیں مل سکا ورنہ وہ اس میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کرتے۔

بہرحال، اردو میں محاورات کی لغات کم ہیں لہٰذا اس کی اپنی ایک اہمیت تو ہے۔ پھر اس میں بعض نادر الوقوع الفاظ و محاورات اور ان کی اسناد آ گئی ہیں جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ یہ امیر مینائی کے قلم سے ہے۔ آیئے اس کے ابتدائی صفحات دیکھتے ہیں۔

باب الف ممدودہ

آپ بیتی: یعنی اپنی سرگزشت

جان صدقے اس پری کے جس نے انشا سے کہا[1]
آپ بیتی کہہ کہانی کچھ کسی کی مت چلا (انشا)

آپ بیتی ہی کہا کرتا ہوں میں راتوں کو[2]
دھیان قصے کا مجھے ہے نہ کہانی کی ہوس (رنگین)

آپ دھاپ: اپنی فکر اور اپنا اندیشہ

جاتے ہی اس کے کیا کہوں بس چال ڈھال دی
تاب و توان و صبر کی یاں آپ دھاپ نے (جرأت)

آپ روپ: یعنی خود بدولت

ٹک بنا بیٹھے جو غصے کی سی صورت آپ روپ
گرچہ تھے بے جرم پر کیا کیا ڈرایا آپ نے (جرأت)

گر آپ روپ ہم سے باتوں میں ٹک کڑے ہوں[3]
سو رگڑے جھگڑے قضیے قصے جھٹ اٹھ کھڑے ہوں (انشا)

آپس کی پھوٹ[4]: یعنی آپس کا خلاف[5] اور نفاق۔

بگڑا دلا معاملہ آپس کی پھوٹ سے
پھوٹا جگر کا آبلہ آپس کی پھوٹ سے (نکہت)

دیدہ و دل مجھ سے کچھ پوچھ کے کرتے نہیں
پھوٹ سے آپس کی آہ مفت یہ گھر جائے گا (نثار)

پھوٹے جو روئے دیدۂ تر پھوٹ پھوٹ خوب
اے جنبشِ مژہ نہیں آپس کی پھوٹ خوب (سرور)[6]

آپ سے آپ: یعنی خود بخود، بے سکھائے کسی کے۔
مجھ سے اب صاف بھی ہو جایوں ہی یار آپ سے آپ
جیسے آیا ہے ترے دل میں غبار آپ سے آپ (ناسخ)[7]

تین حرف اس بتِ بدخو پہ تو اب بھیج نصیرؔ
آپ سے آپ جو ہو جائے خفا تیسرے دن (نصیر)

آپ کا کیا بگڑتا ہے: یعنی آپ کا کیا نقصا، ضرر اور زیاں ہوتا ہے۔
تم جو کہتے ہو کہہ دو حسرت سے
آہ و فریاد یاں کیا نہ کرے
آپ کا اس میں کیا بگڑتا ہے
دردِ دل کی کوئی دوا نہ کرے (حسرت)

آپ کا نام ہوگا ہمارا کام ہوگا: یعنی دونوں کا مقصد حاصل ہوگا۔
تیغ ابرو کو جو آنکھوں کا اشارہ ہوگا[8]
آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہوگا (نثار)

آپ کو دور کھینچنا: یعنی بسببِ نخوت اور باعثِ غور کسی کو اپنا ہم سر اور برابر نہ جاننا۔

بے تکلف ہاتھ کو بستر پہ اے مغرور کھینچ
بیٹھ جا نزدیک[9] بر کے آپ کو مت دور کھینچ (نکہت)

کیا شکوہ جفائے آسماں کا
میں آپ کو دور کھینچتا ہوں (مومن)

آپ کو شاخِ زعفران سمجھنا: یعنی خود کو بہت عمدہ اور اعلیٰ اور نفیس اور شان والا بہمہ صفت موصوف جاننا۔

سمجھتی آپ کو ہے شاخِ زعفراں دیکھو
شگوفہ اور ہی لائی ہے اب کی بار بسنت[10] (شاہ نصیر)

جلے ہے مطبخِ عالی میں جو کوئی ہیزم
بجا ہے آپ کو گر شاخِ زعفراں جانے[11] (نکہت)

سِدرہ کی شاخ بن گئی قبضۂ شاہ میں کماں
شاخِ کمان آپ کو سمجھے ہے شاخِ زعفراں (سرور [دہلوی])[12]

شانہ شاخِ زلفِ گلرو میں
آپ کو شاخِ زعفراں سمجھا (منیر)

بھلا[13] رے یہ دماغ سمجھا ہے
آپ کو شاخِ زعفراں تو نے (انشا)

آپ میں آنا: یعنی ہوش میں آنا۔

ذرا تو آپ میں آنے دو کچھ آتے ہی مت پوچھو
میاں کافر ہو[ں] گر کچھ ہوش اب مجھ میں رہا ہووے (جرأت)

جب تلک یاں جلوہ فرما ہوں نہ آپ
آپ میں آنا مجھے دشوار ہے (نکہت)

آپ ہی آپ ہیں: یعنی دوسرا کوئی نہیں ہے، آپ ہی ہر رنگ میں جلوہ گر ہیں۔[14]

آپ ہی آپ ہیں وہ آپ نے سچ فرمایا
یونہی[15] کچھ دھوکے سے تھے نام کو ہم یا معبود (انشا)

وہی آئنے میں وہی سنگ میں ہے
غرض آپ ہی آپ ہر رنگ میں ہے (نکہت)

آٹھ آٹھ آنسو رُلایا[16]: یعنی زار زار رلایا۔

آٹھ آٹھ آنسو نہ اب کیونکہ پڑے روئیں[17] ہم
چھوڑ تنہا مجھے[18] آٹھوں کے چلے میلے تم[19] (جرأت)

شمع آسا سر سے پا تک صرف گریہ ہو گئے
مثلِ شبنم آٹھ آٹھ آنسو رلایا آپ نے (نکہت)

کیوں آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے مجھ کو تو
ہے گا کسی کے جی کا ستانا بہت برا (انشا)

گر ہم کو لگ گئی[20] ہیں کبھی ہچکیاں تو ہم[21]
آٹھ آٹھ آنسو روئے ہیں دو دو پہر تلک[22] (مصحفی)

روؤں نہ کیوں آٹھ آٹھ آنسو
ہو جاؤں اگر دو چار قاصد[23] (ناسخ)

آہ بے دردانہ وہ ہنستا رہا مانندِ برق
آٹھ آٹھ آنسو مجھے جوں ابرِ گریاں دیکھ کر[۴۴] (نحیف)

آٹھ پہر سولی ہے: یعنی دن رات مصیبت ہے۔
آٹھ پہر سولی ہے دل کو یادِ سرو قامت میں
ہے ایک ہی نکتے کی کمی بیشی قامت اور قیامت میں (نکہت) [کذا][۴۵]

آج زبان کھلی ہے کل بند ہے: یعنی آج زندہ ہیں کل مرجائیں گے جھوٹ کیوں بولیں یہ کلام بطرزِ صداقت اور راست گوئی اکثر زبان پر آتا ہے۔

راست ہی ٹک بولیو ان کی ہی سوگند ہے
آج کھلی ہے زباں کل کے تیئں بند ہے (سودا)

آج کدھر سے چاند نکلا: قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کا مشتاقِ ملاقات ہوتا ہے اور وہ اس کے گھر آتا ہے تو اس کا شائق دیدار کہتا ہے کہ آج کدھر کا چاند نکلا یعنی نہایت تعجب اور نہایت مقامِ حیرت ہے۔
دن کو جو آیا گھر میں مرے وہ سر سے پا تک سارا چاند
گردوں سے خورشید پکارا آج کدھر سے نکلا چاند (نکہت)

نیا یہ بدلی سے چاند نکلا تو بولے سب اہلِ دید دیکھو
یہاں جو تشریف آپ لائے کدھر سے یہ آج چاند نکلا[۴۶] (انشا)

آج کرے گا کل پائے گا: آج مدعا روزِ حیات سے ہے اور کل مقصد ہے روزِ قیامت کے دن سے [کذا] یعنی زندگی میں جیسا عمل کرے گا ویسا ہی حشر کو اجر ملے گا۔ نیکی کا عوض نیکی اللہ دے گا اور بدی کی سزا بدی ملے گی۔

جو کوئی کسی کو یار کلپائے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پائے گا
اس دہر مکافات میں سن اے غافل
جو آج کرے گا سو وہ کل پائے گا (غافل [کذا])[۲۷]

آج کل آرے بلے کرتے ہیں: یعنی وعدہ وفا نہیں کرتے۔
وائے قسمت جن پہ ہم مرتے رہے
آج کل آرے بلے کرتے رہے (نکہت)

آج کل کرتے ہیں: یعنی وعدے کو وفا نہیں کرتے۔
کل سے کل ہوتے ہوئے اے بے وفا برسوں مجھے
آج کل نے تیری مارا آج کل پرسوں مجھے[۲۸] (نکہت)

کہا تھا اس نے مجھے کل کہ آؤں گا میں کل
ملا جو آج تو کل کا وہی پھر آیا خلل
جو پوچھا میں کہ تری کل کو بھی کہیں ہے کل
تو ہنس کے کہنے لگا جا عبث نہ کر کل کل
جو کل کا وعدہ کیا تھا سو کل کو کہتا ہوں چل
غرض یہ اس کا ہے مطلب کہ کرکے لیت ولعل
دہد فریبم و سازد امیدوار مرا
کہ تا بکشر نشاند امیدوار مرا[۲۹] (سودا)

آپ پھر کل لگے بتانے آج
ہووے کافر جو کل کو مانے آج[۳۰] (رنگین)

آج نصیبوں سے ہاتھ لگے ہو: یعنی قسمت کی خوبی سے ملاقات ہوئی ہے۔

اگرچہ تم نہیں ملتے ہو ہم غریبوں سے
پر آج ہاتھ لگے ہو مرے نصیبوں سے (کامل)

کل تک نہیں چھوڑوں گا لگایا جو گلے سے
تم آج نصیبوں سے مرے ہاتھ لگے ہو (نکہت)

آدھی کو چھوڑ ساری کو دوڑ: یعنی یہ کام خرچ والوں کا ہے کہ توکل اور قناعت نہیں کرتے۔

آدھی کو چھوڑ ساری کو دوڑے ہے ماہِ نو
ایسا نہیں جہاں میں کوئی دوسرا حریص (نصیر)

باغ سے دنیا کے رنگیں کچھ نہ پایا اس نے پھل
چھوڑ کر آدھی کو دوڑا حرص سے ساری کو آہ (رنگین)

آدمی نہیں گھن چکر ہے: یعنی بڑا پھرتا ہے بیٹھتا ہی نہیں۔

آرام کرنا اور آرام میں ہونا[۳۱]: یعنی سونا۔

سنتے ہی مرا نام وہ کہتا ہے کہ یارو
ہیں اس گھڑی آرام میں کہہ دو کہ سدھارو (جرأت)

آرسی مصحف دکھلایا: رسم ہے کہ دولہن کو اور دولہ [دولھا] کو بعد نکاح باندھنے کے اور ادا ہونے سب رسموں کے کلام اللہ شریف اور آئینہ درمیان میں [کذا] رکھ کے دکھلاتے ہیں اور نیک شگون سمجھتے ہیں اور آئینہ دکھلانے کی رسم عروس وشور کو سکندر نے جاری کی اور آئینہ بھی اس نے ایجاد کیا ہے، فولاد کا۔ سابق سکندر سے آئینہ نہ تھا۔

اجی دیکھو گے جب تم آرسی مصحف تو ہاں[۳۲] انشا
پڑھے گا سورۂ الحمد اور اخلاص کا جوڑا[۳۳] (انشا)

خطوطِ جدولِ زرّیں بندھا زرتار سہرا ہے
بجائے آرسی مصحف جبین وروے زیبا ہے[۳۴] (نکہت)

آری چل جانا: رنج اور مصیبتیں اور محنتیں اور خواریاں اٹھانا۔

آہ بھی منھ سے نہ نکلی گرچہ یاں
عاشقوں کے سر پہ آری چل گئی (مصحفی)

آڑے آنا: یعنی درمیان میں [کذا] حائل اور حارج ہونا۔

مانع تھا ادھر تو ادب آڑے تھی ادھر شرم
شب لب سے بہم ملنے لبِ یار نہ پایا[۲۵] (ممنون)

مر ہی گئے تھے ہجر کی شب لیک بچ گئے
کیا جانے کب کا آگیا آڑے لیا دیا[۲۶] (معروف)

دیر تک مصروفِ نظارہ رہے ہنگامِ قتل
سخت جانی کا ہوں منت کش کہ آڑے آگئی (نکہت)

آس پاس: یعنی گرد و پیش۔

شیشے دھرے ہیں ہاں[۲۷] مرے دل بر کے آس پاس
یاں آبلے ہیں اس دلِ مضطر کے آس پاس (نصیر)

کہا کل ان سے کسی نے اگر اجازت ہو
تو آس پاس ترے حیفِ ناتواں پھر جائے
یہ سن کے تب متبسم ہو پھر لگا کہنے
جو اس کے جی کی خوشی ہے تو خیر ہاں پھر جائے (حیف)

آستین چڑھانا: یعنی قتل پر آمادہ اور مستعد ہونا۔

کہکشاں کی صبح دم ڈھونڈے نہ پائی آستیں
آسماں نے قتلِ مردم پر چڑھائی آستیں (نکہت)

ذبح کرنے کا نگر قصد ہے اب رنگیں کا
آستینوں کے جو ظالم نے لیے جاک چڑھا[۳۸] (رنگین)

ابرو کو وقتِ ذبح غضب سے نہیں چڑھا
تڑپے مبادا طائرِ دل آستیں چڑھا[۳۹] (سرور)

ہوا دست و گریباں غیر تو پر کیا غضب یہ ہے
کہ مجھ پر تم بھی غصے میں چڑھائے آستیں نکلے (جرأت)

کمر سے غنچہ آسا باندھ کر دامانِ کیں آیا
برنگِ شاخِ گل قاتل چڑھائے آستیں آیا (نصیر)

آستین کا سانپ: یعنی وہ شخص جو پاس رہے اور دشمنِ جاں ہووے۔
پھرا یہ آنکھوں میں اس زلفِ عنبریں کا سانپ
کہ موجِ اشک ہوئی میری[۴۰] آستیں کا سانپ (انشا)

بنا ہے دل مری بر میں بغل کا دشمن ہائے
کہ آستیں کی ہر اک چیں ہے آستیں کا سانپ (نصیر)
ہاتھ کٹواتا ہے گل رو دستِ گل خوردہ کو دیکھ
ہاتھ کیا ہیہات میری آستیں کا سانپ ہے (نکہت)
دل کو پھنسا کے زلف میں اک بے وفا کی آہ
پالا ہے ہم نے سانپ گویا آستین کا (احمدی)

آس ٹوٹنا: امید منقطع ہونا۔

ٹوٹے نہ آس ہر گز[۱۶] ہوں آشنا فغاں کا
لقوترا یہ بنگی ہے میرے استخواں کا[۱۷] (نصیر)

جو کچھ چاہو ہے اپنے داتا کے پاس
بھلا اس سے کیوں توڑیے اپنی آس (انشا)

آسمان پر دماغ ہونا: نہایت غرور اور تمکنت ہونا برابر اپنے کسی کو نہ سمجھنا۔

سمجھ نہ کم قدر مجکو اتنا کہ عشقِ خورشید رو سے غیرت
میں ذرہ ساں گو کہ کچھ نہیں ہوں ہے آسماں پر دماغ اپنا (غیرت)

ہیں جیوں بگولا خاک نشیں اور شان پر
ہے پانو[۱۸] تو زمیں پہ دماغ آسمان پر (نکہت)

دو جہاں سے فراغ رکھتے ہیں
آسماں پر دماغ رکھتے ہیں (نصیر)

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سُنے
ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر (والاؔ)

یہ وہ عشقِ خانہ خراب ہے کہ زمیں پہ اہلِ غرور کو
کوئی دم میں خاک نشیں کرے اگر آسماں پہ دماغ ہو (تجلی)

دیکھ زانو پہ اس کے سر اپنا
ہے دماغ آسمان پر اپنا (مومن)

آسمان ٹوٹنا: آفت ناگہانی اور بلائے آسمانی نازل ہونا اور سخت صدمہ پہنچنا۔

کیونکہ نہ جائے رشتۂ عمر اپنا جان ٹوٹ
فرقت میں تیری مجھ[۴۴] پر گرا آسمان ٹوٹ (جرأت)

بغل میں شیشۂ دل اپنا جو بتاں ٹوٹا
تو سرزمین محبت پہ آسماں ٹوٹا[۴۵] (نکہت)

جو شاخِ گل سے کوئی غنچہ باغباں ٹوٹا
تو سر پہ بلبلِ نالاں کے آسماں ٹوٹا (سرور)

معروف[۴۶] تو اس کے حق میں فقرے مت جوڑ
اپنے پہ تو آسمان آفت کا نہ توڑ
رنگیں سے مقابلہ کچھ آسان نہیں
بھاری پتھر ہے اس کو تو چوم کے چھوڑ (رنگین)

شب فراق ہے یا آسمانِ غم ٹوٹا
الٰہی ہوگی یہ کیسی مجھ پہ بھاری رات (میر)[کذا]

خاک سے کیوں نہ میر یکساں ہو
مجھ پہ تو آسمان ٹوٹا ہے (میر)

آسمان جھانکنا: بسبب چالاکی اور چستی کے آسمان پر چڑھنے کا ارادہ اور قصد ہونا۔

جھانکے ہے ہفت آسماں کو جلدی اس کے ہر قدم
بسکہ عرصہ شش جہت کا منہ پر اس کے تنگ ہے (سودا)

آسمان زمین ایک کر ڈالنا: ہنگامۂ قیامت برپا کرنا، آسمان و زمیں دونوں آپس میں ملا دینا۔

نالۂ نفخِ صور اسرافیل
آسماں و زمین کو ایک کیا (نکہت)

آسماں اور زمیں ایک نہ کردوں پیارے
اب کے فرقت میں تو محشر ہی مرا نام نہیں (محشر)

آسمان کا تھوکا منھ پر پڑتا ہے: یعنی جو کوئی شخص از راہِ غرور کسی کو اپنا ہمسر اور برابر نہیں جانتا انجام کار خراب ہوتا ہے اور جو کوئی کسی کو دشنامِ ناحق دیتا ہے وہ اسی پر اُلٹ کر پڑتی ہے۔

کرے ہے ہم سری اس قد سے قمری سرو چو کے ہے
پڑے ہے منھ پر اس کے آسماں پر جو کہ تھوکے ہے (سرور)

آسمان کے تارے توڑنا: نہایت کارِ دشوار اور سخت کرنا۔

اے ہم نشیں جو خوبیِ طالع سے بے طلب
وہ رشکِ ماہ مجھ سے ملا شب کو آن کے
کہتا تھا جذبۂ دلِ مضطر ز روئے فخر
لایا ہوں تارے توڑ کے میں آسمان کے (نکہت)

آشنا صورت: یعنی وہ شخص کہ جس سے گاہ بگاہ ملاقات ہوتی ہو۔

منھ لگانا تو درکنار انھیں ؏
نہ کہا، ہے یہ آشنا صورت (میر)

ہم نَفَس کوئی نہ دیکھا بے کسی کے دن بقاؔ
آشنا صورت مگر اک معنیِ بے گانہ تھا (بقا)

آشنائی کُٹ کی: یعنی یارانہ ترک کیا۔

لی چیکے سے جب میں نے اس کے چٹکی
بولا کہ پڑے جان پہ تیری پٹکی
پھر دانت تلے کھٹک کے ناخن کو کہا
بس چلیے اب آشنائی ہم نے کُٹ کی (انشا)

آکھ کی بڑھیا: یعنی آکھ کے پھول کے روئیں کہ جو گرمی میں ہوا سے اڑتے پھرتے ہیں۔

پتھورا کے محل کی ہو جو کوئی آکھ کی بڑھیا[۴۸]
بنے وہ آکے بوڑھے اور بڑے عدّاف کا جوڑا[۴۹] (انشا)

ہیں جواں کیوں دومِ الفت میں اسیر
جفت اس کا چاہے [کذا] ہے چرخِ پیر
کیا دو رنگی میں گلِ رعنا ہے یہ
زالِ دنیا آکھ کی بڑھیا ہے یہ (نکہت)

آگ بگولا ہو جانا: نہایت غصہ اور بہت آزردہ اور خفا ہونا

کیوں خاک سے باندھے نہ مری لاگ[۵۰] بگولا
دامن پہ پڑے جس کے وہ ہو آگ بگولا (نصیر)

آگ بن جانا اور آگ ہو جانا: نہایت غصہ اور خشم ناک ہونا۔

تفتہ جانی کا جو مضمون اُسے لکھتا ہوں کوئی
آگ ہو کر وہ مرے خط کو جلا دیتا ہے (معروف)

آگ ہو جاتا ہے ہر دم مری صورت سے جو وہ
شاید اُس سے کوئی کچھ جا کے لگا دیتا ہے (سرور)

عاشق تو جلا ہوا کھڑا ہے
وہ آگ بنا ہوا کھڑا ہے (نصیر)

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو
جب سوزِ دل کہا ہے تو آگ بن گئے ہو (نصیر)

وہ آگ ہو گیا ہے خدا جانے غیر نے
میری طرف سے اس کے تئیں کیا لگا دیا (میر)

آگ لگا پانی کو دوڑے: یعنی آپ ہی فتنہ برپا کیا اور آپ ہی صلح کے در پے ہوئے۔
ضبطِ سرشکِ گرم سے دل تو جلا نصیر
پانی کو دوڑتی ہیں پھر آنکھیں لگا کے آگ (نصیر)

لگا آگ پانی کو دوڑے ہے تو
یہ گرمی تری اس شرارت کے بعد (میر)

آگ لگا جائے: یعنی جل جائے اور اُڑ جائے۔
ابرِ مژگاں کو آگ لگ جائے
کیا برے ڈھب سے یہ برستے ہیں (آشفتہ)

روز اے نالہ کہے ہے تو کروں گا اب اثر
آگ لگ جائے کہیں تیرے اثر کرنے کو (مصحفی)

آگ لینے آئے تھے: یعنی بہت شتاب اور جلد چلے گئے ذرا توقف نہ کیا۔
گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
آگ لینے کو جو اائے تھے تو آنا کیا تھا (میر)

آگ پھونک دینا: یعنی آگ بھڑکا دی اور جلا دیا۔[۵۱]
آشیاں جو بنایا بلبل نے
پھونک دی آگ آتشِ گل نے (نصیر)

پھونک دی ہے عشق نے آتش تنِ لاغر میں کیا
آگ سے کچھ بس نہیں چلتا خس و خاشاک کا (ہوس)

سرد مہری سے بتوں کی ضبطِ آہِ سرد نے[۵۲]
آگ پھونکی تن میں دل جوں پنبہ جل کر رہ گیا (نکہت)

پھونکی ہے سوزِ عشق نے وہ میرے دل میں آگ
خورشید ایک شعلہ ہے اس کا شرارِ برق[۵۳] (معروف)

بجھے گی آتشِ دل ہم نے جانا تھا گھٹا آئی
ہوائے ابر تے پر آگ پھونکی اور گلشن میں[۵۴] (شوق)

کیا کیا آہِ ناتواں تو نے
آگ سی پھونک دی یہاں تو نے (انشا)

آگ جاگ اٹھی: یعنی آتشِ افسردہ روشن ہوگئی۔

جنبشِ دامنِ مژگاں کی ہوا سے کس کی
آگ جاگ اٹھی محبت کی دبی سینے میں (نکہت)

بختِ خفتہ نے جگایا اسے صد حیف نصیر
آگ جو گلخنِ[۵۵] سینہ میں دبی رہتی تھی[۵۶] (نصیر)

تو نے لگائی آکے یہ کیا آگ اے بسنت
جس سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت (انشا)

آگے رنگ لائے گا: یعنی شورش اور فتنہ اٹھائے گا۔

دلا فرقت میں مجھ کو زیست سے تو تنگ لائے گا
ابھی کیا ہے ابھی تو آگے آگے رنگ لائے گا (رنگین)

گریباں پھاڑ پھر سینہ کوئی سنگ لائے گا [کذا]
جنوں میں دست وحشت اور آگے رنگ لائے گا (نکہت)

اشک پر سرخی ابھی سے ہے تو آگے ہم نشیں
رنگ لائے کیسے کیسے دیدۂ تر دیکھیے (میر)

کرے گا قتل تیغی[57] کو چٹا کر سنگ لائے گا
بتوں کا دستِ رنگیں آگے آگے رنگ لائے گا[58] (شیفتہ)

سرشکِ تر کی جا لختِ جگر گلرنگ لائے گا
مرا رنگِ پریدہ آگے آگے رنگ لائے گا (سرور)

کہ عشقِ سبز رنگاں زندگی سے تنگ لائے گا
دلا یہ بنگ[59] پینا آگے آگے رنگ لائے گا (منیر)

آگے رکھ لیا: یعنی روبرو سے بھگا دیا [کذا][60]

اِجماع بو الہوس کو رکھ رکھ لیا ہے آگے
مت جان ایسی بھیڑیں جی دینے والیاں ہیں (میر)

کیا عالم کو کشتہ چشم کے عالم کو دیکھو تو
صفِ مژگاں نے آگے رکھ لیا رستم کو دیکھو تو[61] (نکہت)

چشم نے ابرو کو آگے رکھ لیا
شیر نے آہو کو آگے رکھ لیا (سرور)

آگے ناک سوجھے کیا خاک: یعنی نہایت بے وقوف اور نادان ہیں، صریحاً ایک چیز کہ روبرو آنکھ کے رکھی ہے نظر نہیں آتی اور چار طرف چار طرف ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

آلا: یعنی نیا اور تازہ زخم۔ غور کی جا ہے کہ حرف آلے کا خصوصیت رکھتا ہے [کذا]۔ زخم کے ساتھ کسی تازی شے اور نئی خبر کو آلا نہیں کہتے ہیں۔

تنِ مجروح کو شبنم سے بچانا اے دل
نہ چرا جائیں کہیں زخم ہیں آلے پانی[62] (شاہ نصیر)

لب پر تبخالے[۶۳] تپِ غم کے پا میں جنوں سے چھالے ہیں
تازے ہیں گُل داغِ محبت زخمِ جگر سب آلے ہیں (نکہت)

گھائل ہوں ہیں جس کا اسے پھر پوچھیو یارو
ٹانکے ابھی کھائے ہیں ابھی زخم ہیں آلے (جرأت)

نہ مہکے بوئے گل اے کاش یک چند
ابھی زخمِ جگر سارے ہیں آلے (میر)

پھر بہار آئی چمن میں زخمِ گل آلے ہوئے
پھر مرے داغِ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے (ناسخ)

حواشی:

۱- ''دیوانِ رنگیں [و] انشا'' (مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء، ص ۱۵۰) نیز ''کلامِ انشا'' (مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع، مطبوعہ ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۵۷ء، ص ۴۰۳) اور ''کلیاتِ انشا اللہ خان'' (نول کشور، سن ندارد، ص ۴۸) میں یہ مصرع یوں ہے:

ع جان صدقے اس پری پر، یُوں کہا جن نے مجھے

''پری'' اور ''جان'' (جن) کی رعایت سے ''جن'' بھی خوب ہے۔

۲- ''دیوانِ رنگیں [و] انشا'' (محولہ بالا، ص ۳۵) میں یہ مصرع یوں درج ہے:

ع اپنی بیتی ہی کہا کرتی ہوں میں راتوں کو

۳- ''کلیاتِ انشا'' (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ج ۱، ص ۲۵۴)۔ میں یہاں ''کڑے'' کی بجائے ''کڑی'' ہے جو سہوِ کتابت ہے کیونکہ قوافی کھڑے، لڑے، پڑے، گڑے وغیرہ ہیں۔ ''کلامِ انشا'' (محولہ بالا، ص ۱۴۹) میں بھی ''کھڑے'' ہے۔

۴- ترتیب غلط ہے۔ اصولاً ''آپس'' کے لفظ سے شروع ہونے والے مرکبات کا اندراج اس وقت ہونا چاہیے

جب ''آپ'' کے تحت مرکبات مکمل ہو جائیں۔

۵-اب ''خلاف'' کا لفظ ''اختلاف'' کے معنوں میں نہیں آتا۔

۶-''فرہنگ آصفیہ'' نے بھی ''آپس کی پھوٹ'' کی سند میں یہ شعر دیا ہے لیکن شاعر کا نام ''سرور'' کی بجائے ''مغفور'' دیا ہے۔

۷-''کلیات ناسخ'' (مرتبہ یونس جاوید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ج ۲، ص ۱۴۴) میں یہ مصرع یوں درج ہے:

ع جس طرح ہے تری خاطر میں غبار آپ سے آپ

۸-''فرہنگِ آصفیہ'' نے یہ شعر ''آپ کا'' کی سند میں دیا ہے لیکن اس کی ردیف ''ہوگا'' کی بجائے ''ہوجائے'' لکھی ہے۔

۹-پلیٹس کے نزدیک ''بر'' کے ایک معنی عاشق اور خواستگار کے بھی ہیں۔ نیز ''بر'' کے ایک معنی سینہ اور آغوش کے بھی ہیں۔ اسی طرح چونکہ یہ عرض یا چوڑائی کے معنی میں بھی آتا ہے لہٰذا یہ (بستر کا) عرض کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔

۱۰-''کلیاتِ شاہ نصیر'' (مرتبہ تنویر احمد علوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ج ۱، ص ۴۰۱) میں یہ مصرع یوں دیا گیا ہے:

ع گنتے ہے آپ کو کیا شاخِ زعفراں دیکھو

۱۱-یہ شعر ''آپ کو زعفراں سمجھنا'' کی نہیں بلکہ ''آپ کو شاخِ زعفراں جاننا'' کی سند ہے۔

۱۲-یہی شعر اسی اندراج کی سند میں ''امیر اللغات'' (ج ۱) میں بھی درج ہے اور وہاں شاعر کا پورا نام سرور دہلوی لکھا ہے۔

۱۳-''بھلّہ'' غالباً ''بھلا'' کا ایک املا ہے۔

۱۴-کاتب نے یہاں ہیں کی بجائے ہے لکھا ہے۔

۱۵-کاتب نے ''یوہیں'' لکھا ہے جو ''یونہی'' کا قدیم املا ہے لیکن ''کلیاتِ انشا'' (محولہ بالا، ص ۱۲۹) میں یہاں ''یونہی'' کی بجائے ''یوں بھی'' درج ہے۔ اسی طرح ''کلامِ انشا'' (محولہ بالا، ص ۸۷) میں بھی ''یوں بھی'' ہے۔

۱۶-کاتب نے ''رُلایا'' کا املا یہاں اور تشریح نیز اسناد میں بھی واو کے ساتھ یعنی ''رولایا'' کیا ہے۔

۱۷-''کلیاتِ جرأت'' (مرتبہ اقتدا حسن، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ج ۱، ص ۲۳۲) میں ''روئیں'' کی بجائے ''روویں'' ہے۔

۱۸-''کلیاتِ جرأت'' (محولہ بالا) میں ''ہمیں'' بجائے ''مجھے'' درج ہے۔

۱۹-یہ شعر ''آٹھ آٹھ رُلانا'' کی نہیں بلکہ ''آٹھ آٹھ رونا'' کی سند ہے۔

۲۰-کاتب نے ''گئی'' کو ''گئیں'' لکھا ہے۔

۲۱-''کلیاتِ مصحفی'' (مرتبہ نورالحسن نقوی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ج ۱، ص ۲۴۱) میں یہ مصرع یوں درج ہے:

ع گر ہم کو لگ گئی کبھی ہیں ہچکیاں تو ہم

۲۲-یہ شعر آٹھ آٹھ آنسو ''رلانا'' کی بجائے ''رونا'' کی سند ہے۔

۲۳-ایضاً۔

۲۴-اس شعر میں نہ ''رونا'' کا لفظ آیا ہے نہ ''رلانا'' کا، لہٰذا یہ صرف ''آٹھ آٹھ آنسو'' کی سند ہے۔ امیر مینائی نے رونا اور رلانا کا الگ الگ اندراج کرنے کی بجائے ایک ساتھ ہی اس کی اسناد دے دی ہیں لیکن یہ شعر ان دونوں کی سند نہیں ہے۔

۲۵-''فرہنگِ آصفیہ'' نے بھی یہ شعر ''آٹھ پہر سولی ہے'' کی سند میں دیا ہے لیکن اس میں دوسرا مصرع یوں ہے:

ع ہے اک نقطے کی کم و بیشی قامت اور قیامت میں

۲۶-''کلیات انشا'' (محولہ بالا ص ۵۴) میں یہ شعر یوں درج ہے:

یہاں جو تشریف آپ لائے کدھر سے یہ آج چاند نکلا
کہ ماہِ کنعاں بھی جس کے آگے جو خوب سوچا تو ماند نکلا

۲۷-''امیر للغات'' (ج ۱) میں بھی ''آج کرے گا کل پائے گا'' کی سند میں یہ اشعار دیے ہیں لیکن انھیں وہاں رباعی لکھا ہے اور شاعر کا نام ''دردمند'' درج ہے۔ جبکہ فرہنگِ آصفیہ میں یہ اشعار ''کلپانا'' کی سند میں دیے ہیں اور اسے ''قطعۂ مرزائی'' قرار دیا ہے۔ آصفیہ میں چوتھا مصرع یوں درج ہے:

ع بیداد کرے گا آج کل پائے گا

میر اللغات (ج ۱) میں چوتھے مصرع میں ''سو'' کی بجائے ''تو'' ہے۔

۲۸-یہ شعر ''آج کل کرنا'' یا ''آج کل کرتے ہیں'' کی سند نہیں ہے۔

۲۹-ان اشعار میں سے کوئی بھی ''آج کل کرنا'' یا ''آج کل کرتے ہیں'' کی سند نہیں ہے بلکہ ''آج کل'' کی بھی سند نہیں۔

۳۰-یہ شعر بھی آج کل کرنا کی سند نہیں ہے۔

۳۱-یہ شعر آرام کرنا کی سند نہیں ہے بلکہ صرف آرام میں ہونا کی سند ہے۔

۳۲-''کلیاتِ انشا'' (محولہ بالا، ص ۶۷) اور ''کلامِ انشا'' (محولہ بالا، ص ۴۴) دونوں میں پہلے مصرعے میں ''ہاں'' کی بجائے ''واں'' ہے۔

۳۳-یہ شعر آرسی مصحف ''دکھلانا'' کی بجائے ''دیکھنا'' کی سند ہے۔

۳۴-یہ شعر نہ تو آرسی مصحف دکھلانا کی سند ہے اور نہ آرسی مصحف دیکھنا ہی کی سند ہے۔ بلکہ یہ صرف ''آرسی مصحف''

کی سند کے طور آ سکتا ہے۔

۳۵-یہ آڑے آنا کی نہیں آڑے ہونا کی سند ہے۔

۳۶-یہ "لیا دیا آڑے آنا" کی سند ہے نہ کہ صرف آڑے آنا کی۔

۳۷-کاتب نے آبلے کی بجائے آبلہ لکھا ہے۔

۳۸-یہ "آستین چڑھانا" کی نہیں بلکہ "آستینوں کے چاک چڑھانا" کی سند ہے۔

۳۹-یہاں "آستین چڑھانا" قتل پر آمادہ ہونے کے معنی میں نہیں بلکہ لڑنے پر آمادہ ہونے یا کسی کام کا ارادہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اسے الگ شق کے تحت معنی نمبر ۲ کے طور پر درج کرنا چاہیے تھا۔

۴۰-"کلیاتِ انشا" (مرتبہ خلیل الرحمٰن (اوّدی، ص۸۴) میں میری کے بجائے اپنی ہے۔ اسی طرح "کلامِ انشا" (مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع، ص۵۲) میں بھی "اپنی" ہے۔

۴۱-"کلیاتِ شاہ نصیر" (مرتبہ تنویر احمد علوی، ج۱، ۲۲۶) میں ہرگز کی بجائے "مرکز" ہے۔

۴۲-"کلیات شاہ نصیر" (محولہ بالا) میں بھی یہ مصرع اس طرح درج ہے۔

۴۳-پانو (یعنی نون غنّے کے ساتھ، پ ا ں و) کا یہ املا درست ہے گو رائج "پاؤں" ہے اور کاتب نے "پانوں" لکھا ہے اور یہ املا بھی بعض متون میں ملتا ہے۔

۴۴-"کلیات جرأت" محولہ بالا، ج۱، ص۳۷۳) میں مجھ کے بجائے ہم ہے۔

۴۵-دوسرے مصرعے میں کاتب نے لفظ آسماں کے بعد "پہ" سہواً دوبارہ لکھ دیا ہے۔

۴۶-یہاں مراد ہیں الٰہی بخش معروف جن سے رنگین بگڑ گئے تھے اور ان کے خلاف سو (۱۰۰) رباعیاں کہیں۔ یہ رباعیاں "سبع سیارۂ رنگیں" کے تیسرے حصے میں "سحۂ رنگیں" کے نام سے شامل ہیں (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: صابر علی خاں، سعادت یار رنگین، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص۲۶۴)۔

۴۷-"کلیاتِ میر" (مرتبہ کلب علی خاں فائق، مجلسِ ترقی ادب لاہور، طبع دوم ۱۹۹۲ء، ج۳، ص۷۸) میں "انھیں" کی بجائے "ان نے" ہے۔

۴۸-"کلیاتِ انشا" (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، ص۶۱) میں یہ مصرع یوں درج ہے:

پتھورا کے جو محلوں کی ہو کوئی آکھ کی بڑھیا

۴۹-"کلامِ انشا" (مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع، ص۴۰) میں یہ مصرع یوں ہے:

بنے وہ آکے اس بوڑھے بڑے نداف کا جوڑا

۵۰-لاگ باندھنا یعنی بیر باندھنا (نور اللغات)

۵۱-آگ پھونک "دینا" کی تشریح میں "بھڑکا دی" اور "جلا دیا" کی بجائے "بھڑکا دینا" اور "جلا دینا" بہتر ہوتا۔ مصدر کی تشریح میں صیغۂ ماضی مناسب نہیں۔ نیز ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے یہ غلط مقام پر درج ہے۔

۵۲-یہ آگ "پھونک دینا" کی نہیں بلکہ "آگ پھونکنا" کی سند ہے۔ نیز اس اندراج کو ترتیب میں یہاں نہیں ہونا

چاہیے تھا۔

۵۳-ایضاً۔

۵۴-یہ بھی پھونک دینا کی بجاے پھونکنا کی سند ہے۔

۵۵-گلخن یعنی انگیٹھی، بھٹی۔

۵۶-یہ آگ جاگ اٹھنا کی نہیں بلکہ آگ جگانا کی سند ہے۔

۵۷-تیغی: متداول اردو لغات میں درج نہیں ہے، بظاہر ''تیغ'' سے ہے۔

۵۸-یہ شعر ''کلیاتِ شیفتہ'' (مرتبہ کلب علی خاں فائق مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء) میں نہیں ملا۔

۵۹-بنگ یعنی بھنگ۔

۶۰-''آگے رکھ لینا'' کے ایک معنی یہ بھی لغات میں درج ہیں لیکن یہاں دی گئی اسناد سے یہ معنی نہیں نکل رہے۔ ''بہارِ ہند'' (مرتبہ مرتضی عاشق لکھنوی، نول کشور، ۱۸۸۸ء) میں ''آگے رکھ لینا'' تو نہیں ہے مگر ''آگے دھر لینا'' درج ہے اور اس کے معنی لکھے ہیں'' آنکھوں کے سامنے رکھنا، حراست میں رکھنا، گرفتار کرا دینا''۔ یہی معنی یعنی آنکھوں کے سامنے رکھنا یہاں ان اسناد سے نکل رہے ہیں اور خود امیر نے بھی امیر اللغات میں آگے دھر لینا / رکھ لینا اور آگے دھرنا / رکھنا میں یہ معنی بھی دیے ہیں: ''سامنے رکھ لینا'' وغیرہ۔ یہ پیش پیش رکھنا یا مقدم رکھنا کے معنی میں بھی آتا ہے۔

۶۲-کلیاتِ شاہ نصیر (مرتبہ تنویر احمد علوی) مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ج ۳، ص ۲۰۶) میں دوسرے مصرعے میں ''یہ'' بجاے ''ہیں'' ہے۔ لیکن آلا کی سند میں یہی شعر فرہنگِ آصفیہ میں بھی درج ہے اور وہاں بھی ''ہیں'' ہے۔

۶۳-تب خالے / تہ خانے کو تپ خالے بھی لکھا جاتا ہے۔ تب خالہ یا تپ خالہ وہ چھالا ہے جو بخار کی وجہ سے بالعموم ہونٹوں پر ہو جاتا ہے، آبلہ تپ۔ (ماخوذ از آصفیہ)

اردو محاورات: انیسویں صدی میں مطبوعہ دو اہم لغات

اردو کی کہاوتوں، محاوروں اور روزمرہ کی جو لغات انیسویں صدی میں شائع ہوئیں انھوں نے اردو کے ذخیرۂ الفاظ کو محفوظ بھی کیا اور آنے والے لغت نویسوں کا کام بھی آسان کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کے لغت نویسوں نے اس خوشہ چینی کا اعتراف کشادہ دلی سے نہ کیا ہو لیکن بعد کی لغات میں ان سے ''فراخ دلی'' سے ''استفادہ'' کرنے کے شواہد موجود ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ایسی لغات میں (جنھوں نے بعد کے لغت نویسوں کی مدد کی) ''ہندوستانی مخزن المحاورات'' اور ''محاوراتِ ہند'' بھی شامل ہیں۔ درحقیقت یہ اردو میں محاورات کی ابتدائی لغات تھیں۔ ان سے قبل اردو لغات تو لکھی جا چکی تھیں اور ان میں محاورات بھی شامل تھے لیکن صرف محاورات پر مبنی اردو کی اولین مطبوعہ لغات یہی دو ہیں۔ دونوں کی اشاعتِ اول میں چند سال کا فصل ہے، دونوں محاورات کی لغات ہیں، دونوں کی اشاعت دہلی سے ہوئی اور ان کے مولفین کا تعلق بھی دہلی سے تھا۔ اس مقالے میں ہم پہلے دونوں لغات کا تعارف پیش کریں گے اور پھر دیکھیں گے کہ ان میں کیا امتیازات ہیں اور دونوں کی قدر و قیمت کیا ہے۔

☆ ''ہندوستانی مخزن المحاورات''

منشی چرنجی لال کی مرتبہ ''ہندوستانی مخزن المحاورات'' پہلی بار ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں محاورات کے علاوہ کہاوتیں، روزمرہ اور بعض مرکبات بھی شامل ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں بعض مفرد اندراجات بھی شامل ہیں حالانکہ یہ محاورات کی لغت ہے اور اس میں مرکبات اور کہاوتوں تک کا اندراج بلا جواز ہے، مفرد اندراجات کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس میں البتہ کہاوتیں کم تعداد میں ہیں۔ کتاب کی لوح پر درج عبارت کے مطابق اس میں ''اصطلاحیں'' بھی شامل ہیں۔

''مخزن المحاورات'' کے پہلے ایڈیشن میں سرورق پر اس کے نام کے ساتھ لفظ

''ہندوستانی'' بھی لکھا گیا تھا۔ گویا اس کا پورا نام ''ہندوستانی مخزن المحاورات'' ہے گو یہ معروف ''مخزن المحاورات'' کے نام سے ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن راقم کی نظر سے گزرا ہے اور ذرا کم یاب ہے لہٰذا اس کی لوح کی عبارت بعینہٖ یہاں پیش کی جارہی ہے۔ اس کا املا بھی اصل کے مطابق رہنے دیا گیا ہے اور جو الفاظ ملا کر لکھے گئے تھے انھیں بھی نہیں بدلا گیا۔ سطور کی ترتیب بھی اصل کے مطابق ہے (پروف خوان حضرات مدیران رمبصرین سے گزارش ہے کہ ازراہِ کرم اسے تبدیل نہ فرمائیں):

''ہندوستانی

مخزن المحاورات

جس میں

ہندی اور اردو کے ہر قسم کے محاورے اور اصطلاحیں دس ہزار

کے قریب بڑی تلاش اور جستجو سے جمع کر کے درج کی گئی ہیں انکے

ثبوت میں ناظمانِ بیمثال و ناثرانِ باکمال کا کلام اور روزمرہ کے

معنی خیز فقرے اور ضرب الامثال پیش کی گئی ہیں۔ اکثر محاوروں

اور اصطلاحوں کی وجہ تسمیہ اور شانِ نزول بھی حتی الوسع بڑی

تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے

مولفہ

منشی چرنجی لال صاحب دہلوی

مولف **اردو زبان کی تاریخ** اور **رسالہ ہندوستانی فلولوجی**

(علم اللسان) وسابق اسسٹنٹ ڈاکٹر فیلن صاحب بہادر مرحوم صاحب

مولف ہندوستانی انگریزی ڈکشنریات

بذریعہ رجسٹری تمام حقوق محفوظ ہیں

۱۸۸۶ء

مطبع محب ہند فیض بازار دہلی میں چرنجی لال

مالک مطبع کے اہتمام سے چھپا''۔[۱]

یہ تو تھی پہلے ایڈیشن کی لوح کی عبارت۔ ''ہندوستانی مخزن المحاورات'' کا دوسرا ایڈیشن امپیریل بک ڈپو پریس، دہلی، سے لالہ امیر چند نے (ان کے اپنے الفاظ کے مطابق) ''نظر ثانی و تصحیح ضروری تغیر و تبدل کرا کر اور تمام فحش محاورات کو نکلوا کر'' شائع کیا۲۔ اس پر سال ۱۸۹۸ء درج ہے۔ اس لوح پر درج عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ لالہ امیر چند (جنھوں نے ''تغیر و تبدل'' کیا تھا) ''اسسٹنٹ ماسٹر سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول دہلی'' تھے ۳۔

افسوس کہ منشی چرنجی لال کے تفصیلی حالاتِ زندگی دست یاب نہیں ہیں۔ ظفر الرحمٰن دہلوی کے مطابق منشی چرنجی لال دہلوی فیلن کے ''مددگار ایڈیٹر'' اور ''میٹرک کلکتہ یونیورسٹی'' تھے۔ نیز یہ کہ ''ان کا اختیاری مضمون سنسکرت'' تھا۴۔ دوسرے ایڈیشن کی لوح پر منشی چرنجی لال کے نام کے ساتھ ''مرحوم دہلوی'' لکھا ہے۵۔ گویا ۱۸۹۸ء میں یا اس سے پہلے ہی منشی صاحب دنیا سے گزر چکے تھے۔ البتہ منشی چرنجی لال صاحب نے طبع اول کے دیباچے میں فیلن کے مختصر اًحالات زندگی لکھے ہیں اور فیلن کے حالات میں اپنا کچھ احوال بھی بیان کیا ہے۔ یہ حالات یہاں حرف بحرف (اسی املا میں) پیش ہیں جس میں کچھ اغلاط بھی ہیں، مثلاً لیے کو لئے لکھا ہے اور ڈکشنری کو ڈکشنیری، وغیرہ۔ (پروف ریڈر حضرات سے گزارش ہے کہ ازراہِ کرم اصلاح دینے کی کوشش نہ فرمائیں):

> ''سب سے پہلے میں اپنے ولیٔ نعمت محققِ زباں مفتیِ لساں فیلسوف زمانہ جناب ایس ڈبلیو ڈاکٹر فیلن صاحب بہادر مرحوم سابق انسپکٹر مدارس حلقۂ بہار کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے پٹنہ عظیم آباد سے دہلی میں آکر اپنی ہندوستانی انگریزی ڈکشنیری بنانی شروع کی اور مجکو اپریل ۱۸۷۵ء میں دہلی کالج کی فرسٹ ایر کلاس میں سے بلوا کر اپنے محکمہ لغات میں اپنا اسسٹنٹ مقرر فرمایا۔ صاحب ممدوح زبان کی تحقیقات کے لیے اکثر دورہ فرماتے رہتے تھے چنانچہ پورب میں پٹنہ تک پنجاب میں لاہور تک راجپوتانہ میں اجمیر تک تمام مشہور امصار و اشہار قصبہ و دیار اور کوہ منصوری وغیرہ کی سیر کرائی۔ ان مقامات کے اکثر خاص و عام گویئے بلوا کر انکی

چیزیں سنوائیں۔ مختلف زبانوں کی ڈکشنریاں، گریمریں اور فلولوجی کے
رسالے میرے سپرد کیئے۔

شمالی ہندوستاں کے مختلف حصوں کی بولیوں کی ہندی الفاظ سے ملتے
ہوئے لفظوں کی فہرستیں جو صاحب ممدوح کے معاون بھیجا کرتے تھے اپنی
ڈکشنری میں منتخب کر کے داخل کرنے کے لئے حوالے کیں۔ ہندی الفاظ
کی اصل سنسکرت سے تحقیق کرنے کی خدمت کے علاوہ ڈکشنری میں
الفاظ ومحاورات زیادہ کرنے اور انکا انگریزی میں ترجمہ کرنے کے [کذا]
مقرر فرمائی۔ الغرض اپریل ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۳ء تک صاحب ممدوح
کے دفتر میں لغت ہی کا کام کرتا رہا۔ جسکے سبب سے میری سابقہ واقفیت
اور تجربوں میں بہت بڑی ترقی ہوئی''۶۔

اس دیباچے پر ۲۲ر جون ۱۸۸۶ء کی تاریخ پڑی ہے۔

حاشیے میں چرنجی لال نے فیلن کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے فیلن کے بارے میں جو
لکھا ہے اسے پرانے املا میں بعینہٖ مع اغلاط لکھا جا رہا ہے:

''جو اپریل ۱۸۸۰ء میں لندن باغراضِ چند در چند تھوڑے عرصہ کے لئے
تشریف لے گئے تھے اور وہیں ۳ر اکتوبر ۱۸۸۰ء کو درانحالیکہ انکے بعد
ہندوستان میں انکے انکی [کذا] انگریزی ہندوستانی ڈکشنری بن رہی تھی
راہی ملکِ عدم ہوئے''۷۔

حامد حسن قادری کے مطابق چرنجی لال الہ آباد کے رہنے والے تھے اور ان کی ایک کتاب
''مصباح المساحت'' کے عنوان سے ہے نیز نفسیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''تعلیم
النفس'' کے نام سے کیا۸۔ لیلیٰ عبدی خجستہ نے بھی چرنجی لال کے حالات زندگی اور ان کی کتابوں
پر کچھ روشنی ڈالی ہے۹۔ گارسیں دتاسی نے منشی چرنجی لال کی دس (۱۰) کتابوں کا ذکر کیا ہے۱۰۔

''ہندوستانی مخزن المحاورات'' کے دیباچے میں منشی صاحب نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ
انھوں نے یہ کام ۱۸۸۴ء میں شروع کیا اور ''اب جون ۱۸۸۶ء میں کئی اسسٹنٹوں کی قابلِ تعریف

معاونت سے ایک صرفِ کثیر کے بعد اختتام کو پہنچایا'' [۱۱]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں انھیں فیلن کے دفتر سے فراغت حاصل ہوئی ہوگی تو انھوں نے اس کام کا آغاز کیا ہوگا اور اس کام میں یقینی طور پر فیلن کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ نیز ممکنہ طور پر کچھ مواد جو انھیں فیلن سے دست یاب ہوا ہوگا کام آیا ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فیلن نے ان کے ذمے جو خدمات ''مقرر فرمائی'' تھیں ان کی تعداد کچھ کثیر اور ان کا ذکر قدرے طویل معلوم ہوتا ہے۔ اگر فیلن صاحب نے یہ سارے کام ان کے ذمے کر دیے تھے تو وہ خود کیا کرتے تھے؟ بہر حال، مبالغے کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی منشی صاحب کا فیلن کی لغت میں یقیناً حصہ ہوگا اور ان کی لغت نویسی کی مہارت اور اردو زبان پر ان کے احسان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن فیلن کے کئی معاون تھے جن کا ذکر منشی صاحب نے نہیں کیا۔ منشی صاحب کے اپنے بیان کے مطابق ان کی بنیادی تربیت فیلن ہی نے کی تھی اور وہ بھی اس وقت جب وہ دہلی کالج کے سالِ اول میں تھے۔ فیلن کے معاونین میں منشی چرنجی لال کے علاوہ یہ حضرات بھی شامل تھے جنھوں نے فیلن کی مختلف لغات میں ان کی مدد کی تھی: لالہ فقیر چند دہلوی (مددگارِ اول)، لالہ چرنجی لال دہلوی، لالہ ٹھاکر داس دہلوی، لالہ جگن ناتھ دہلوی، ایس ایچ واٹلنگ، منشی لیاقت حسین دنیا پوری، پنڈت شیو نرائن، سید احمد دہلوی، منشی نہال چند، بشیشر ناتھ، رام پرشاد دہلوی، رام ناتھ تیواڑی فرخ آبادی، لالہ کشوری لال دہلوی، منشی احسان علی رہتکی، محمد محمود میرٹھی، نیز کچھ انگریز معاونین جنھوں نے فیلن کی موت کے بعد اس کی لغت کا بقیہ کام ترتیب دے کر شائع کیا [۱۲]۔ افسوس کہ ان میں سے بیشتر کا ذکر لغت نویسی کی تاریخ اور جائزوں میں حواشی میں بھی بار نہیں پاتا۔ البتہ حال ہی میں لیلیٰ عبدی خجستہ نے ان کا ذکر اپنے ایک مقالے میں کیا ہے [۱۳]۔

عجیب بات یہ ہے کہ کئی اہم کاموں کے باوجود ایس ڈبلیو فیلن کے بارے میں مستند معلومات بہت کم دست یاب ہیں حتیٰ کہ سوانح عمریوں کے معروف برطانوی سلسلے ''ڈکشنری اوف نیشنل بایوگرافی'' (جو مختصراً ڈی این بی (DNB) کہلاتا ہے) میں بھی فیلن کا ذکر نہیں ہے (برطانوی تاریخ کے اہم لوگوں کے تعارف پر مبنی اس سلسلے کی ساٹھ جلدیں برخط یعنی اون لائن (online) بھی دست یاب ہیں)۔ محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے کہ گریرسن کی مختصر تحریر، جس کا

ترجمہ مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو کے دیباچے میں درج ہے، اور سی ای بک لینڈ (C.E. Buckland) کی Dictionary of Indian Biography میں فیلن کے اجمالی ذکر کے علاوہ گارسیں دتاسی کی تحریروں سے بعض اشارے ملتے ہیں جن سے، بقول ان کے، محی الدین قادری زور نے بھی معلومات اخذ کی ہیں۱۴۔ فیلن نے کم از کم پانچ لغات مرتب کیں جن میں A New Hindustani-English Dictionary بہت معروف ہے اور اہم تصور کی جاتی ہے۱۵۔

دیباچے کے علاوہ مخزن المحاورات میں ایک تفصیلی مقدمہ بھی ہے۔ مقدمے میں منشی صاحب نے اصطلاح اور محاورے کا فرق بھی بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اصطلاح کا مادہ صلح ہے اور اس کے لغوی معنی باہم صلح کرنے کے ہیں۔ اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں کسی قوم کا باہم اتفاق کرنا کسی لفظ کے نئے معنی علاوہ اس کے اصلی معنی کے قائم رکھنے کے لیے۔ پس اصطلاح وہ ایک نئے معنی ہیں جو ایک لفظ یا چند الفاظ کو متعدد آدمی باہم اپنے کسی خاص اظہارِ مطلب کے لیے پہناتے ہیں اور وہی لوگ بولتے یا سمجھتے ہیں'' ۱۶

اس کے بعد محاورے اور اصطلاح پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''محاورے کا مادہ حَوَر ہے جس کے معنی [ہیں] پھرنا یا گردش کرنا۔ جب کوئی اصطلاح جس کو چند آدمی اپنے کسی خاص اظہارِ مطلب کے لیے مقرر کرتے ہیں زیادہ عام ہو جاتی ہے اور بہت سے آدمیوں میں پھیل جاتی ہے اور اپنے پہلے معنی سے کسی قدر ملتے ہوئے دوسرے معنی پہن لیتی ہے تو اس کو محاورہ کہنے لگتے ہیں۔ مثلاً نائیوں کی اصطلاح میں ''مونڈنے'' کے معنی ''کسی کے سر کے بال استرے سے کاٹنا'' ہیں چونکہ مونڈنے میں حجامت بنوانے والے کے بال لیے جاتے ہیں اسی سبب سے اس کے معنی محاورے میں ''ٹھگنا یا دھوکا دے کر کسی کا مال لے لینا'' ہو گئے۔ اسی طرح درزیوں کی اصطلاح میں ''کتر بیونت'' کے معنی ''کسی کے نئے کپڑے کی

قطع و برید یا کاٹ چھانٹ'' ہیں۔ اس قطع و برید میں درزی اکثر کپڑا اچھا
بھی لیا کرتے ہیں اس وجہ سے اس کے معنی محاورے میں'' چالاکی، عیاری
یا دھوکے بازی'' ہو گئے''۔۱۷

لیکن افسوس کہ منشی صاحب نے روزمرہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی حالانکہ اس لغت میں ان کے اپنے دعوے کے مطابق'' روزمرہ'' بھی موجود ہے۔ کتاب کی ترتیب و تدوین کے بارے میں منشی صاحب نے مقدمے میں بتایا ہے کہ معنی بیان کرتے ہوئے شعرا کے کلام سے سند لی گئی ہے اور ایک طویل فہرست ایسے شعرا کی دی ہے جن سے اسناد لی گئیں۔ بقول خودان کے اس ضمن میں سب سے زیادہ میر، سودا، ذوق، جرأت، داغ، آتش، ناسخ، بحر، جان صاحب وغیرہ کا کلام آیا ہے ۱۸۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس لغت میں'' مثلیں، روزمرہ کے فقرے، دوہے، پہلیاں، ٹھمریاں، ہولیاں، بھجن، گھریلو گیت، چو بولے، فقیروں کی صدائیں، دلی کے ترکاری والوں کی میٹھی میٹھی آوازیں اور چھن وغیرہ چیزیں نظیراً دی ہیں''۱۹۔

ہندوستانی مخزن المحاورات کا پہلا ایڈیشن سات سو پچپن (۷۵۵) صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں پانچ (۵) صفحات کا صحت نامہ ہے۔ آخر میں انگریزی کی لوح بھی ہے۔ ابتدا کے اکیس صفحات ان کے علاوہ ہیں۔ دیباچے، تقریظوں اور قطعۂ تاریخ کے انیس (۱۹) صفحات ہیں۔ بیسویں صفحے پر لغت میں استعمال کی گئی علامات کی وضاحت کی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

اصطلاح	:	معنی
پنجابی	:	اہل پنجاب کا محاورہ
عو	:	عورتوں کا محاورہ
کم	:	کم بولا جاتا ہے
م ف	:	متعلق فعل
نظم	:	نظم میں آتا ہے
؟	:	شبہہ [کذا: شبہے] کی نشانی

ہندوستانی مخزن المحاورات کے پہلے ایڈیشن میں پہلا اندراج'' اب'' کا ہے، آخری

اندراج ''یہاں کا یہیں'' کا ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ کسی صفحے اندراجات پر زیادہ ہیں اور کسی پر کم۔ اگر ہر صفحے پر اوسطاً بارہ یا تیرہ اندراجات بھی فرض کیے جائیں تو ساڑھے سات سو (۷۵۰) صفحات پر مشتمل اس لغت میں نو ہزار سے دس ہزار اندراجات ہوں گے۔ خود مولف نے یہ تعداد دس ہزار بتائی ہے۔

پہلے ایڈیشن میں شامل چند اندراجات کا مختصر جائزہ پیش ہے:

۔بالاتفاق:

اسے ''ف'' یعنی ''فارسی'' قرار دیا ہے۔ جو درست نہیں۔ یہ عربی ترکیب ہے۔ پھر ترتیب میں اسے ''بالا بتانا یا دینا'' کے بعد درج کیا ہے جبکہ اصولاً ''ب'' بطور سابقہ درج کر کے اس کے تحت میں ''بالاتفاق'' کا اندراج ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اصل میں تو یہ نہ محاورہ ہے نہ اصطلاح لہٰذا اس کے اندراج کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔

۔جیبھ کے تلے جیبھ ہے:

اسے ''محاورہ'' قرار دیا ہے، جبکہ یہ کہاوت ہے۔

۔جیتی مکھی نہیں نگلی جاتی:

اسے بھی محاورہ لکھا ہے اور یہ بھی کہاوت ہے۔

۔فقیری لٹکا:

اسے ''اسم مذکر'' قرار دیا ہے۔ اول تو یہ مرکبِ توصیفی ہے۔ ثانیاً، محاورہ نہیں ہے اور نہ اصطلاح ہے لہٰذا ''محاورات'' اور (بقول مولف) ''اصطلاحات'' کی لغت میں اس کے اندراج کا کیا جواز ہے؟ شاید یہ اس لیے شامل کیا گیا کہ مجازی معنوں میں ہے۔ گو محاورہ بھی مجازی معنی میں ہوتا ہے مگر محاورے میں مجاز کے ساتھ مصدر کا ہونا بھی شرط ہے۔ ثالثاً، معنی لکھے ہیں ''سہل اور آسان سانسخہ، چھومنتر''۔ یہاں ''سہل اور آسان سانسخہ'' تک تو ٹھیک ہے لیکن ''چھومنتر'' سے مغالطہ ہوتا ہے۔ کیا اس سے مراد جادو ہے؟ واضح نہیں ہے۔

۔کوہ قاف:

اسے ''اسم مذکر'' قرار دیا ہے۔ اول تو مرکب ہے، پھر محاورہ نہیں ہے۔ ہاں مجازی معنی درج

کیے ہیں: ''تاریک اور نا قابلِ گزر مقام''۔ لیکن صرف مجازی معنی اسے محاورہ نہیں بناتے لہٰذا محاورات کی لغت میں یہ اندراج غیر ضروری ٹھہرتا ہے۔ ہاں عمومی لغات میں اس کا اندراج لازم ہے۔

۔لڑکا بالا:

لکھا ہے ''اسم مذکر''۔ یہ بھی ترکیب ہے۔ محاورہ بھی نہیں ہے۔ روزمرہ ہے۔

۔ناخن میں پڑے ہیں:

اسے محاورہ قرار دیا ہے۔ مثالیہ جملہ لکھا ہے: ''تم جیسے تو میرے ناخنوں میں پڑے ہیں'' (یعنی تمھاری کوئی حیثیت نہیں)۔ اول تو اندراج میں ناخن یعنی واحد ہے اور مثال میں جمع (ناخنوں) آئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر محاورہ ہے تو اندراج میں بھی مصدر چاہیے یعنی ''ناخن میں پڑا ہونا'' بہتر ہوتا۔

اس لغت میں بعض مفرد اندراجات بھی شامل ہیں مثلاً بکی، بگاڑ اور بگڑنا۔ حالانکہ یہ محاورات کی لغت ہے۔ اسی طرح بعض کہاوتوں مثلاً ''پانی پی کر ذات پوچھتے ہو'' اور ''پیٹ میں ڈاڑھی ہے'' کو ''محاورہ'' قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ ''مخزن المحاورات'' میں بعض مفرد الفاظ یا مصادر کے مجازی معنی بھی درج ہیں (مثلاً لفظ ''برسنا'' کے)۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں، جبکہ اردو زبان اور لغت نویسی کے بہت سے مباحث کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا، طے ہونا تو دور کی بات ہے، اس طرح کی چھوٹی موٹی اغلاط نظر انداز کیے جانے کے قابل ہیں۔ اس زمانے میں اتنی ضخیم لغت اور بڑی تعداد میں اہم اندراجات کا شمول ہی اسے لغت کو اہم اور قابلِ ستائش بناتا ہے۔ پھر اکثر تشریحات / معنی بہت واضح اور رواں زبان میں ہیں، اور تشریحات میں اغلاق شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ لغت نویسی میں تشریح نگاری ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور بڑے بڑوں سے اس میں یا غلطی ہو جاتی ہے، تشریح یا مغلق ہو جاتی ہے یا تشنہ رہ جاتی اور کبھی وضاحت کی خواہش میں غیر ضروری طور پر طویل ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب لغت میں تشریح نویسی کے عیوب ہیں۔ لیکن چرنجی لال اس دور کے لحاظ سے اس میں خاصے کام یاب ہیں۔ اس لغت میں سے کئی اندراجات ایسے ہیں جو ''فرہنگِ آصفیہ'' وغیرہ میں بھی نہیں ملیں گے۔ گویا ''ہندوستانی مخزن المحاورات'' ایک اہم اور قابلِ قدر لغت ہے۔

☆ ''محاوراتِ ہند''

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں مرتبہ اردو لغات میں ''محاوراتِ ہند'' بھی شامل ہے اور یہ بھی محاورات کی لغت ہے۔اس کا تاریخی نام ''لطائفِ بے نظیر'' (۱۳۰۲ ہجری ر ۸۵۔۱۸۸۴ء) ہے جو ابتدائے تالیف کا سال ہے۔اس کے مرتب مولوی سبحان بخش ہیں اور اس میں کہاوت، محاورہ اور روزمرہ کا اندراج ہے۔ان کے علاوہ بعض فقرے، اصطلاحات اور مرکبات بھی درج ہیں۔ حالانکہ کتاب کے نام سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اس میں صرف محاورات ہوں گے۔یہ پہلی بار دسمبر ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی ۲۰۔

مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی نے اپنے بحولہ بالا مضمون میں ''محاوراتِ ہند'' کا سالِ طباعت ۱۸۸۹ء/۱۳۰۴ھ درج کیا ہے ۲۱۔ لیکن ۱۳۰۴ ہجری کی تطبیق ۱۸۸۹ء سے نہیں ہوتی بلکہ ۸۷۔۱۸۸۶ء سے ہوتی ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن، جو مطبع مجتبائی (دہلی) سے شائع ہوا، ہماری نظر سے گزرا ہے۔اس پر تاریخ اشاعت دسمبر ۱۸۹۰ء درج ہے۔یکم دسمبر ۱۸۹۰ء کو ہجری تاریخ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۰۸ تھی ۲۲۔لہٰذا اس کے پہلے ایڈیشن کا سالِ اشاعت ۱۸۹۰ء/۱۳۰۸ ہجری ٹھہرتا ہے۔

محاوراتِ ہند کے پہلے ایڈیشن کی لوح کی عبارت یہاں ہو بہو پیش کی جارہی ہے۔املا بھی بعینہٖ وہی ہے اور سطور کی ترتیب بھی اصل کے مطابق ہے (از راہِ کرم اسے تبدیل نہ کیجیے):

۷۸۶

محاوراتِ ہند

جسکو

افضل العلما مولوی سبحان بخش صاحب سابق مدرس

کالج عربی دہلی نے مطبع کی فرمایش سے تالیف کیا

اور

مولوی حافظ عبدالاحد صاحب نے باضابطہ رجسٹری کرا کے اپنے

مطبع مجتبائی دہلی میں طبع کیا

ماہ دسمبر ۱۸۹۰ء ۲۳

کتاب کے آغاز میں ایک مختصر دیباچہ مولف کے قلم سے ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی سبحان بخش صاحب ضلع مظفر نگر کے قصبے شکار پور کے رہنے والے تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے دہلی کالج میں "مدرسِ عربی" اور جنگِ آزادی کے بعد دہلی کالج میں "مدرسِ عربی و فارسی و اردو" تھے۲۴۔ دیباچے میں مزید لکھتے ہیں کہ اردو زبان سے مستفید ہونے کے لیے "وسیلۂ کامل" ابھی تک فراہم نہیں ہوا ہے اور یہ کہ:

> "سب سے پہلے جس کا اس طرف خیال ہوا وہ منشی سید احمد دہلوی ہیں جو اردو زبان کی ایک بسیط لغت لکھ رہے ہیں... اس کے بعد امثال میں صاحبِ "نجم الامثال"۔ لیکن محاورات کی طرف ابھی تک کسی کا خیال رجوع نہیں ہوا اور نہ آج تک کسی نے جمع کیے"۲۵

ان کا یہ کہنا کہ "محاورات کی طرف ابھی تک کسی کا خیال رجوع نہیں ہوا اور نہ آج تک کسی نے جمع کیے" اس لیے درست نہیں ہے کہ "ہندوستانی مخزن المحاورات"، جس کا ذکر اوپر کی سطور میں ہوا ۱۸۸۶ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکی تھی۔ جبکہ "محاوراتِ ہند" ۱۸۹۰ء کے آخری مہینے میں منظرِ عام پر آئی۔ خود مولف کے مطابق "سنینِ ابتداءِ تالیف "لطائفِ بے نظیر" [۱۳۰۲ھ] سے حاصل ہوتے ہیں"۲۶۔ ہجری سال ۱۳۰۲ کی تطبیق سال عیسوی ۸۵-۱۸۸۴ء سے ہوتی ہے۔ "سنینِ اختتام" کے لیے انھوں نے ایک شعر دیا ہے جس کے پہلے مصرعے سے تاریخ (۱۳۰۴ ہجری) نکلتی ہے اور وہ ہے:

> "از نظمِ دل فریب بدو حرفِ آخری
> از بہرِ اختتام بگفتم چہار حرف"۲۷

اس میں مادۂ تاریخ "از نظمِ دل فریب" سے برآمد ہو رہا ہے جو ۱۳۰۴ ہجری (یعنی ۸۷-۱۸۸۶ء) ہے۔ پھر لکھتے ہیں "اور "بیان ظرفاء ہند" بھی یہی فائدہ دیتا ہے"۔۲۸ گویا خود "محاوراتِ ہند" کے مولف مولوی سبحان بخش کے بیان کے مطابق اس کی تالیف کا آغاز ۱۳۰۲ ہجری (۸۵-۱۸۸۴ء) میں ہوا اور ۱۳۰۴ ہجری (۸۷-۱۸۸۶ء) میں اختتام کو پہنچی۔ کتاب پر سالِ اشاعت ۱۸۹۰ء (دسمبر) درج ہے، اور اس کی مطابقت ۱۳۰۸ ہجری سے ہوتی

ہے۔ گویا محاوراتِ ہند کی تکمیل تک مخزن المحاورات شائع ہوچکی تھی۔ لہٰذا ان کا اولیت کا دعویٰ درست نہیں ہے۔

ان کا یہ دعویٰ بھی درست نہیں کہ محاورات کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی کیونکہ بعض مختصر مطبوعہ یا غیر مطبوعہ لغات (جن کے قلمی نسخوں کا ذکر بعض مآخذ میں ملتا ہے) کو نظر انداز کردیا جائے تب بھی ''محاوراتِ ہند'' سے پہلے ''مخزن المحاورات'' مولفہ منشی چرنجی لال دہلوی ۱۸۸۶ء میں شائع ہوچکی تھی جو ایک ضخیم لغت ہے۔ ساڑھے سات سو صفحات پر مبنی ''مخزن المحاورات'' میں اردو محاورات اور ان کے معنی کثیر تعداد میں درج ہیں اگرچہ اس میں بھی محاورات کے علاوہ کہاوتیں، روزمرہ، مرکبات اور فقرے درج ہیں۔ اس کا ذکر سطورِ بالا میں ہوچکا ہے۔ مولوی سبحان بخش کے خود اپنے بیان کے مطابق، ''محاورات ہند'' کی ترتیب و تالیف کا کام انھوں نے ۸۵-۱۸۸۴ء میں شروع کیا تھا۔ گویا ''مخزن المحاورات'' کی اشاعت سے پہلے۔ لیکن ''محاوراتِ ہند'' کی تکمیل مولف کے اپنے بیان کے مطابق ۸۷-۱۸۸۶ء میں ہوئی اور چرنجی لال کی ''مخزن المحاورات'' ۱۸۸۶ء میں شائع ہوچکی تھی اور دہلی ہی سے شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ تو ممکن ہے کہ آغازِ تالیف کے وقت انھیں چرنجی لال کے کام کا علم نہ ہو اور انھوں نے یہ دیباچہ بھی اس کی اشاعت سے پہلے لکھ لیا ہو جس میں اولیت کا دعویٰ ہے لیکن ''مخزن المحاورات'' کی ۱۸۸۶ء میں اشاعت کے بعد تقریباً چار سال کے بعد ''محاوراتِ ہند'' کی اشاعت کے وقت یہ دعویٰ عجیب سا لگتا ہے اور اس ضمن میں، چھوٹی موٹی مطبوعہ اور بعض غیر مطبوعہ لغاتِ محاورات سے قطع نظر، اولیت کا دعویٰ ''مخزن المحاورات'' ہی کو زیبا ہے (گو اس کے مولف نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا) اور مولف ''محاوراتِ ہند'' کے لیے یہ نامناسب ہے۔

''محاوارتِ ہند'' کے پہلے ایڈیشن (۱۸۹۰ء) کے صفحات کی تعداد، ایک اشتہار اور دیباچے کو چھوڑ کر، دو سو سات (۲۰۷) ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ اندراجات کسی صفحے پر کم کسی پر زیادہ ہیں۔ مثلاً صفحہ ۷۷ پر صرف چودہ (۱۴) اندراجات ہیں اور صفحہ ۱۴۳ پر چونتیس (۳۴) اندراجات ہیں۔ لیکن اگر ہر صفحے پر اوسطاً پچیس (۲۵) اندراجات فرض کیے جائیں تو ان کی کل تعداد پانچ ہزار سے کچھ متجاوز ہوگی۔ گویا ''مخزن المحاورات'' کے دس ہزار اندراجات کے مقابلے

میں بھی ''محاوراتِ ہند'' بہت پیچھے ہے اور اس کے اندراجات کی تعداد تقریباً نصف ہی ہوگی۔

پھر ''محاوراتِ ہند'' کے اندراجات میں کثیر تعداد میں کہاوتیں بھی شامل ہیں۔ مولف نے ہر حرف کی تقطیع کو دو حصوں میں بانٹا ہے، پہلے اس حرف سے شروع ہونے والے محاورات کا اندراج کیا ہے اور پھر کہاوتوں کا۔ حالانکہ محاورات کی لغت میں کہاوتوں کا اندراج اپنے دائرے سے تجاوز کرنا ہے۔ مخزن المحاورات پر بھی یہ اعتراض ہوسکتا ہے لیکن اس میں کہاوتوں کا الگ حصہ نہیں بنایا گیا اور منشی چرنجی لال نے وضاحت کی ہے کہ:

> ''ہماری زبان میں پانچ سات ہزار سے کم ضرب الامثال نہیں ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک بڑے واقعہ [کذا: واقعے]، معاملہ [کذا: معاملے]، واردات یا کسی قصے کا خلاصہ ہے گویا یہ کہاوتیں ملک کی ایک بڑی تاریخ ہیں۔ چونکہ بہت سی ضرب المثالیں [کذا] بطور محاورہ بھی بولی جاتی ہیں گو اس وجہ سے محاوروں میں دی جاتیں تو کچھ بے جا بھی نہ تھا مگر خالص محاورے اور مثل میں فرق قائم رکھنے اور ضخامت بڑھ جانے کے اندیشے سے ان کو صرف مثالاً دیا ہے۔ کہیں کوئی مثل محاورے میں داخل ہوگئی ہے ورنہ ہزار دو ہزار جو اس مخزن میں آئی ہیں وہ سب بطور مثال درج کی گئی ہیں''۲۹؎۔

اس وضاحت سے کم از کم یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ منشی چرنجی لال مولفِ مخزن المحاورات کو اس قباحت کا احساس تھا جو محاورات کی لغت میں کہاوتوں کے اندراج سے ہوسکتی ہے۔ لیکن ''محاورات ہند'' کے مولف سبحان بخش نے باقاعدہ الگ حصوں میں تقطیع کے تحت کہاوتیں درج کی ہیں اور کوئی وضاحت بھی نہیں کی۔

''محاوراتِ ہند'' کے بعض اندراجات نہ محاورات میں شامل ہیں اور نہ کہاوتوں میں، مثلاً ''کمک کی'' (ص ۱۴۶)۔ ویسے بھی اس طرح کے اندراجات کو مصدر کے ساتھ درج کرنا چاہیے یعنی ''کمک کی'' کی بجائے ''کمک کرنا'' کا اندراج بہتر ہوتا۔ پھر اس لغت میں معنی اور تشریحات مختصر ہیں اور بعض تو بہت ہی مختصر ہیں، جیسے ''کمک کی'' کے معنی لکھے ہیں ''مدد کی''۔ محاوراتِ ہند''

کے مولف نے ''مخزن المحاورات'' کے برعکس نہ تو ماخذ زبان (فارسی، عربی وغیرہ) کی نشان دہی کی ہے اور نہ اندراجات کی قواعدی حیثیت (اسم، مذکر وغیرہ) ہی بتائی ہے۔ بلکہ ''محاوراتِ ہند'' میں الف بائی ترتیب کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ مثلاً الف کی تقطیع کے آخری اندراجات میں ''ایام ابیض'' کے بعد ''اب کہاں جاتے ہو''، ''اپنا سر کہا'' اور ''اڑتی بات ہے'' کے اندراجات ملتے ہیں۔ صفحہ ۷۶ اور ۷۷ پر اچھی خاصی بے ترتیبی ہے اور قاری کو کسی خاص اندراج کی تلاش میں سارے اندراجات دیکھنے پڑتے ہیں کیونکہ یہ یقینی نہیں کہ کون سا اندراج کہاں ہے، اپنی جگہ پر ترتیب کے مطابق ہے یا مولف کی مرضی کے مطابق۔ ''محاوراتِ ہند'' کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۹۱۳ء میں مطبع مجتبائی (دہلی) سے شائع ہوا۔ اس میں بھی یہی بے ترتیبی موجود ہے۔

گویا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر میں شائع کی گئی ان دو لغات میں سے مخزن المحاورات ہر لحاظ سے محاوراتِ ہند سے بہتر ہے، اندراجات کی تعداد کے لحاظ سے، ترتیبِ اندراجات کے لحاظ سے اور تشریح کے لحاظ سے۔ زمانی طور پر بھی مخزن المحاورات کو تقدم حاصل ہے۔ لیکن یہ دونوں لغات اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں اردو کے ایسے الفاظ، محاوارت، کہاوتیں اور معنی درج ہیں جن سے بعد میں آنے والے لغت نویسوں نے فائدہ اٹھایا۔

حواشی:

۱۔ ملاحظہ ہو: لوح، ہندوستانی مخزن المحاورات (دہلی: مطبع محبِ ہند، ۱۸۸۶ء) [اشاعتِ اول]

۲۔ لوح، ہندوستانی مخزن المحاورات، (دہلی: امپیریل بک ڈپو پریس، ۱۸۹۸ء) [اشاعتِ ثانی]۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ دیکھیے: ہماری کہاوتیں، مشمولہ ''رہنماے اردو محاورات وضرب الامثال'' (مرتبہ عدنان عادل زیدی و مخدوم صابری، لاہور، ملک بک ڈپو، ۲۰۰۹ء، ص ۴۵۵)۔ سید یوسف بخاری دہلوی کی اطلاع کے مطابق ظفر الرحمن دہلوی کا یہ مضمون ''ہماری کہاوتیں'' جون ۱۹۶۲ء کے قومی زبان میں شائع ہوا تھا (مرقع اقوال وامثال، دیباچہ، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء)۔ لیکن بخاری صاحب سے یا کاتب سے شاید سال و ماہ لکھنے میں کوئی غلطی

ہوگئی ہے کیونکہ یہ قومی زبان کے ۱۹۶۲ء کے شماروں میں شامل نہیں ہے۔ بہر حال یہ مضمون ''رہنمائے اردو محاورات وضرب الامثال'' (مذکورہ بالا) میں بھی شامل ہے اور یہ اطلاع وہیں سے ماخوذ ہے۔

۵۔ لوح، ہندوستانی مخزن المحاورات، (دہلی: امپیریل بک ڈپو پریس، ۱۸۹۸ء) [اشاعتِ ثانی]۔

۶۔ دیباچہ، ہندوستانی مخزن المحاورات، اشاعتِ اول، ص ۳۔۲

۷۔ ایضاً، حاشیہ ص ۲۔ لیکن مولوی ظفر الرحمن نے فیلن کے انتقال کی تاریخ ۳/ اکتوبر ۱۸۸۰ء کی بجائے ۶/ جون ۱۸۸۰ء لکھی ہے، دیکھیے: ہماری کہاوتیں، محولہ بالا، ص ۴۶۰۔

۸۔ داستان تاریخ اردو (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۲۷۔۲۲۶ [اشاعتِ چہارم]

۹۔ ایس ڈبلیو فیلن کے محکمۂ لغت میں شامل معاونین، مشمولہ معیار، اسلام آباد، شمارہ ۱۷، جنوری۔ جون ۲۰۱۷ء، ص ۲۳۔۲۰

۱۰۔ تاریخ ادبِ ہندوستانی، ترجمہ وحواشی لیلیان نذرو، مشمولہ ''جریدہ''، شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۳۷، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۔۲۲۶

۱۱۔ دیباچہ، ہندوستانی مخزن المحاورات، اشاعتِ اول، ص ۱۔

۱۲۔ ظفر الرحمن، مولوی، محولہ بالا، ص ۴۶۰۔

۱۳۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: مقالہ بعنوان ایس ڈبلیو فیلن کے محکمۂ لغت میں شامل معاونین، محولہ بالا۔

۱۴۔ تعارف، مشمولہ Fallon's English-Urdu Dictionary، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۳ء) [طبع چہارم]۔

۱۵۔ فیلن کی لغات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: رؤف پاریکھ، فیلن کی اردو بہ انگریزی لغت اور اس کے چند دلچسپ اور نادر اندراجات، مشمولہ لغوی مباحث، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۳۲۔۱۱۳

۱۶۔ مقدمہ، ہندوستانی مخزن المحاورات، اشاعتِ اول، ص ۶۔

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ لوح ''محاورات ہند'' (دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۸۹۰ء) [اشاعتِ اول]۔

۲۱۔ ہماری کہاوتیں، محولہ بالا، ص ۴۵۶۔

۲۲۔ ضیاء الدین لاہوری، جوہرِ تقویم (لاہور: جمعیت پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۲۵۔

۲۳۔لوح ''محاورات ہند'' (دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۸۹۰ء) [اشاعتِ اول]۔

۲۴۔دیباچہ، محاوراتِ ہند، اشاعتِ اول، محولہ بالا، ص ۲۔

۲۵۔ایضاً۔

۲۶۔ایضاً۔

۲۷۔ایضاً، ص ۳۔

۲۸۔ایضاً۔

۲۹۔دیباچہ، مخزن المحاورات، ۲۵، ص ۱۴ [اشاعتِ اول]۔

مآخذ:

۱۔بخش، مولوی سبحان، محاورات ہند، دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۸۹۰ء، اشاعتِ ثانی۔

۲۔بخش، مولوی سبحان، محاورات ہند، دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۹۱۳ء، اشاعتِ ثانی۔

۳۔پاریکھ، رؤف، لغوی مباحث، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء۔

۴۔چغتائی، محمد اکرام، تعارف، مشمولہ Fallon's English-Urdu Dictionary ، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۳ء، طبع چہارم۔

۵۔خجستہ، لیلیٰ عبدی، ایس ڈبلیو فیلن کے محکمۂ لغت میں شامل معاونین، مشمولہ معیار، اسلام آباد، شمارہ ۱۷، جنوری۔جون ۲۰۱۷ء، ص ۴۲۔۹

۶۔دتاسی، گارسیں، تاریخ ادبِ ہندوستانی، ترجمہ وحواشی لیلیان نذرو، مشمولہ ''جریدہ''، شعبۂ تصنیف وتالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۲۷، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳۸۔۲۰۱

۷۔دہلوی، مولوی ظفر الرحمن، ہماری کہاوتیں، مشمولہ ''رہنمائے اردو محاورات وضرب الامثال'' (مرتبہ عدنان عادل زیدی ومخدوم صابری)، لاہور: ملک بک ڈپو، ۲۰۰۹ء، ص ۴۶۴۔۴۵۱

۸۔دہلوی، یوسف بخاری، مرقع اقوال وامثال، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء۔

۹۔قادری، حامد حسن، داستان تاریخ اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء، اشاعتِ چہارم۔

۱۰۔لال، منشی چرنجی، ہندوستانی مخزن المحاورات، دہلی، مطبع محبِ ہند، دہلی، ۱۸۸۶ء، اشاعتِ اول۔

۱۱۔لال، منشی چرنجی، ہندوستانی مخزن المحاورات، دہلی، امپیریل بک ڈپو پریس، دہلی، ۱۸۹۸ء۔اشاعتِ ثانی۔

۱۲۔لاہوری، ضیاء الدین، جوہرِ تقویم، لاہور: جمعیت پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

زبان اور صنفی اختلاف: خواتین کی اردو اور اس کی لغات

کیا خواتین کی زبان مردوں کی زبان سے الگ ہوتی ہے؟ کیا اعلیٰ طبقے کی زبان عام لوگوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے؟ کیا ایک ہی طبقے کے مرد اور خواتین ایک ہی زبان الگ الگ انداز میں بولتے ہیں؟

سماجی لسانیات (sociolinguistics) کے ماہرین کے مطابق کسی معاشرے میں مختلف طبقاتی پس منظر کے حامل افراد کی زبان باقی لوگوں کی زبان سے مختلف ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے، خواہ وہ سب ایک ہی زبان (مثلاً اردو) بولتے ہوں۔ مختلف طبقات کی زبان مثلاً غریب علاقے کی اردو اور امیر علاقے کی اردو میں فرق ہوسکتا ہے۔ دراصل کسی بھی معاشرے میں تکلم (speech) میں کئی وجوہ کی بنا پر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان وجوہات میں مختلف نسلی یا سماجی پس منظر بھی شامل ہے[1]۔

☆لسانی فرق (language variation)

دل چسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی طبقے یا یکساں سماجی پس منظر کے حامل افراد کی زبان میں بھی فرق ہوسکتا ہے اور اس کی وجہ عمر یا صنف بھی ہوسکتی ہے، مثلاً بوڑھوں کی زبان نوجوانوں کی زبان سے اور عورتوں کی زبان مردوں سے مختلف ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے، چاہے وہ ایک ہی ماحول بلکہ ایک ہی خاندان سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔ بوڑھوں اور جوانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں واضح فرق ہوتا ہے اور یہ ہر زمانے اور ہر زبان میں ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کے تمام بولنے والے اس کو بالکل ایک ہی طرح استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک ہی زبان مختلف طبقات یا خطوں میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس فرق یا تبدیلی کو اصطلاحاً اختلاف یا لسانی فرق (language variation) کہتے ہیں[2]۔ اس فرق کی وجہ طبقاتی حیثیت، جنس، تعلیم، پیشہ، عمر

اور دیگر سماجی اسباب و دائرہ ہائے کار ہو سکتے ہیں۳۔ زبان میں اس طرح کا فرق جو طبقاتی تفاوت، تعلیمی پس منظر، عمر، پیشے یا جنس وغیرہ کی وجہ سے واقع ہو اسے سماجی بولی یعنی سوشل ڈائیلکٹ (social dialect) کہتے ہیں۴۔ یاد رہے کہ مختلف جغرافیائی یا علاقائی خطوں میں کسی زبان میں واقع ہونے والے لسانی فرق (variations) بھی بولی یعنی ڈائیلکٹ ہوتے ہیں مگر وہ علاقائی تحتی بولی (regional dialect) کے ذیل میں آتے ہیں اور ان کی بنیاد طبقہ نہیں جغرافیائی محلِ وقوع ہے۔ لیکن سرِ دست ان پر گفتگو کا یہ محل نہیں ہے۔

☆صنفی اختلاف اور لسانی فرق

صنفی اختلاف زبان پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے اس کی ایک دل چسپ مثال جارج یول (George Yule) نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شمالی امریکا اور جزائر غرب الہند کی بعض زبانوں کے ابتدائی مطالعے کے بعد لسانی ماہرین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان میں سے بعض علاقوں میں مرد اور عورتیں الگ الگ زبانیں بولتے ہیں، بعد میں انھیں احساس ہوا کہ صنفی اختلاف کی بنا پر دونوں صنفوں کی زبانوں میں اتنا فرق ہے کہ بظاہر وہ دو مختلف زبانیں لگتی ہیں مگر درحقیقت ہیں نہیں۵۔ اسی طرح آر ایل ٹراسک (R.L.Trask) نے اپنی کتاب میں جاپانی زبان کے بعض ایسے الفاظ دیے ہیں (ماں، کھانا وغیرہ) جن کے لیے مرد اور عورتیں الگ الگ لفظ استعمال کرتے ہیں۶۔

صنفی اختلاف کی بنا پر زبان میں جو فرق اور اختلاف واقع ہوتا ہے اس کی ایک بڑی مثال عورتوں کی اردو اور اس کے مخصوص الفاظ و محاورات ہیں۔ دراصل گھر سے باہر کی دنیا سے ربط ضبط ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے اندازِ نظر و فکر میں بہت فرق واقع ہوتا ہے اور اس کا اثر زبان پر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں خواتین روایتی طور پر گھر کی چار دیواری تک محدود رہتی تھیں اور اگر باہر نکلنا بھی ہوتا تھا تو سخت پردے میں نکلنے کے بعد پردہ دار خواتین ہی سے مل سکتی تھیں۔ نہایت قریبی مرد رشتے داروں سے بھی گفتگو ایک خاص دائرے اور مخصوص لفظیات تک محدود رہتی تھی۔ آج سے ایک صدی پہلے تک بھی ہمارے روایتی گھرانوں کی اکثر خواتین کی زندگی کا بیش تر حصہ گھر کے ایک محدود حصے میں گزرتا تھا جسے زنان خانہ کہتے تھے۔ مردانہ بیٹھک گھر کے

الگ حصے میں واقع ہوتی تھی۔

خواتین کی گفتگو کے موضوعات بھی محدود اور مخصوص ہوتے تھے، مثلاً سیاسیات و معاشیات یا عالمی واقعات کی خواتین اڑتی اڑتی خبریں ہی سنتی تھیں۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ نسبتاً محدود یا کم از کم مختلف ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک زمانے میں خواتین کی اردو اور مردوں کی اردو میں بہت فرق ہوا کرتا تھا اور اس مخصوص اردو زبان کی لغات بھی مرتب کی گئیں۔ اگرچہ اب خواتین اور مردوں کی زبان میں اتنا فرق نہیں ہوتا اور اس کی ایک بڑی وجہ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کا فروغ اور مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول ہے۔ اگرچہ کچھ فرق تو اب بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانے میں خواتین اور مردوں کی زبان میں نمایاں فرق تھا اس وقت خواتین کی اردو نہ صرف تلفظ اور تلحین (یعنی گفتگو میں اتار چڑھاو جسے انگریزی میں intonation کہتے ہیں) کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی (مثلاً اردو بولنے والی بعض خواتین کے لہجے میں ایک مخصوص لٹکا پایا جاتا تھا جو بعض علاقوں میں اب بھی موجود ہے) بلکہ ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی مختلف ہو گیا تھا۔ خواتین نے اپنے نئے الفاظ اور محاورے بنا لیے، کچھ لفظوں کے نئے معنی پیدا کر لیے اور کچھ چیزوں کے لیے اشارے کنائے ایجاد کر لیے۔[7]

☆خواتین کی زبان اور اس کی لغات

فی الحال ہمارا موضوع وہ الفاظ یا محاورے نہیں ہیں جو خواتین نے بنا لیے تھے۔ بلکہ سر دست ہمارا موضوع خواتین کی مخصوص اردو پر مبنی لغات ہیں جو مختلف ادوار میں مرتب کی گئیں۔ تاہم صرف چند الفاظ و تراکیب اور ان کے وجود میں آنے کی وجوہ کی نشان دہی موضوع کی تفہیم میں مفید ہوگی۔

اس مخصوص زبان کے وجود میں آنے کی وجوہ میں عورتوں کی شرم و حیا، توہم پرستی اور خوف بھی شامل تھا۔ اس کی تفصیل وحیدہ نسیم نے دی ہے[8] مثلاً عورتیں سانپوں، چڑیلوں اور جنات سے ڈرتی تھیں لہٰذا ان کا ذکر اشاروں میں کرتی تھیں، جیسے سانپ کو رسی کہنا، جن کو ماموں کہنا یا چڑیلوں کو اوپر والیاں کہنا۔ اسی طرح توہم پرستی کی وجہ سے بعض چیزوں کے نام لینا بھی بدشگونی یا نحوست سمجھی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک کالے رنگ کی چڑیا جادو ٹونے میں استعمال ہوتی تھی

اور اسے دھوبن کہا جاتا تھا۔ لہٰذا دھوبن کو عورتیں ''اُجلی'' کہتی تھیں۹۔ اسی طرح خواتین فطری شرم کی وجہ سے بعض اشیا کو اشارے کنائے میں بیان کرتی تھیں، جیسے: چھوٹے کپڑے (اندر پہنے جانے والے کپڑے)، آنچل (پستان)، آنچل دبانا (نوزائیدہ بچے کا دودھ پینا)۱۰۔ بعض الفاظ انھوں نے درج تو کر دیے ہیں لیکن بوجہ شرم ان کی تشریح نہیں کی (حالانکہ شرع، طب، قانون اور لغت میں کوئی لفظ فحش نہیں ہوتا، کیونکہ نیت علم و تحقیق کی ہوتی ہے)، مثلاً خاموشی (حیض، نیز حیض کا کپڑا)، کُسم کا آزار (ایک مرض جس میں ماہواری کا خون بہتا رہتا ہے، دراصل کسم ایک پھول ہے جس سے گہرا سرخ رنگ نکلتا ہے)، صندل گھسنا (عورتوں کی ہم جنسی)۔ البتہ انھوں نے ان الفاظ کی شعر و نثر سے اسناد دے دی ہیں۱۱۔

ذیل میں خواتین کی جن لغات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کچھ میں ایسے الفاظ اور محاورات موجود ہیں جو مذکورہ بالا اشیا یا حرکات کو مخصوص الفاظ و محاورات میں بیان کرتے ہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ ان لغات سے قبل اور ان کے بعد بھی بعض کتابیں ایسی لکھی گئی ہیں جن میں خواتین کی زبان کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ انشا، رنگین اور بعض ریختی گو شعرا نے عورتوں کا جو مخصوص ذخیرۂ الفاظ (خواہ وہ کتنا ہی مبتذل یا بظاہر بازاری کیوں نہ ہو) اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے وہ بھی زیرِ بحث آسکتا ہے۔ لیکن یہاں خواتین کی زبان کی لغات کا ذکر ہے۔

ذیل میں ان اردو لغات کا مختصر تعارف پیش ہے جن میں خواتین کی مخصوص اردو کے الفاظ، محاورات اور مرکبات مع معنی درج ہیں۔

☆لغات النسوان (۱۹۰۷ء)

اس لغت کا پورا نام ''لغات النسوان: عورتوں کے محاورے اور روز مرہ'' ہے۔ مولوی سید امجد علی اشہری کی مرتبہ اس لغت کو اردو میں خواتین کی زبان کی پہلی باقاعدہ لغت کہنا چاہیے۔ یہ پہلی بار ۱۹۰۷ء میں خادم التعلیم اسٹیم پریس (لاہور) نے شائع کی۔ اس کا ایک نیا ایڈیشن لاہور سے دار التذکیر نے ۲۰۰۳ء میں محمد احسن خان کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا۔

لیکن اس کے پہلے ایڈیشن میں محبوب عالم (مدیر پیسہ اخبار، لاہور) کا ایک دیباچہ بھی

بعنوان ''زنانہ اردو بول چال'' شامل تھا جس کو دوسرے ایڈیشن سے نجانے کیوں خارج کر دیا گیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ناشرین ایسی اہم تحریروں کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں اور اگر واقف بھی ہیں تو چند صفحات کا کاغذ بچانے کی خاطر انھیں نہیں چھاپتے۔ حال ہی میں کچھ ہندستانی علمی کتابیں ہمارے ناشرین نے (غالباً بغیر اجازت) شائع کی ہیں لیکن ان میں سے بعض کے آخر میں موجود چند صفحات کی فہرستِ مآخذ کو اُڑا دیا گیا ہے۔ کیوں؟

بہر حال، محبوب عالم کے تحریر کردہ چار صفحوں کے اس دیباچے میں کام کی باتیں بھی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پیسہ اخبار [کے عملے] نے اس میں فرہنگِ آصفیہ، مخزن المحاورات، امیر اللغات، نفائس اللغات اور مولوی نذیر احمد کی کتابوں کے علاوہ تہذیبِ نسواں اور اس طرح کی بعض دیگر تحریروں سے اقتباس لیے ہیں۔ اگرچہ کسی بھی کتاب یا تحریر کے متن کا اضافہ شدہ فقروں کے ساتھ حوالہ نہیں دیا گیا اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ کیا اس کے لیے مولف کی اجازت لی گئی تھی اور اگر نہیں تو مولف کی اجازت کے بغیر پریس کا عملہ کسی کتاب کے متن میں کیسے رد و بدل کر سکتا ہے۔

پہلے ایڈیشن میں متن تین سو سولہ (۳۱۶) صفحات پر محیط تھا جو دوسرے ایڈیشن میں کمپیوٹر کی کتابت کی وجہ سے دو سو اڑسٹھ (۲۶۸) صفحات میں مکمل طور پر سما گیا۔ اس لغت میں تقریباً تین ہزار اندراجات ہیں لیکن سب صرف خواتین سے مخصوص نہیں کہے جا سکتے۔ بہر حال مفید اور اہم کام ہے۔

☆لغات النسا (۱۹۱۷ء)

سید احمد دہلوی، مولف فرہنگ آصفیہ، کی مرتبہ ''لغات النسا'' پہلی بار ۱۹۱۷ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ بڑی تقطیع کی اس لغت کا متن دو سو چھیانوے (۲۹۶) صفحات پر مبنی تھا۔ لوح کی عبارت کے مطابق ''کاشی رام پریس سابقہ نول کشور پریس لاہور میں چھپ کر دفتر فرہنگِ آصفیہ دہلی سے شائع ہوئی''۔ آخر میں قطعۂ تاریخ طبع بھی ہے جس سے ۱۹۱۷ء کا سال برآمد ہوتا ہے۔ سید احمد دہلوی نے اپنے ترقیمے میں اطلاع دی کہ ''آج ۱۰/اپریل ۱۹۱۷ء'' کو تسوید مکمل ہوئی۔

اس میں خواتین کی مخصوص زبان کے تقریباً پانچ ہزار الفاظ و مرکبات شامل ہیں۔ شنید ہے کہ یہ لاہور سے ۱۹۸۸ء میں دوبارہ بھی شائع کی گئی لیکن راقم کی نظر سے یہ ایڈیشن نہیں گزرا۔

☆محاوراتِ نسواں (۱۹۳۰ء)

اس لغت کا پورا نام "محاوراتِ نسواں اور خاص بیگمات کی زبان" ہے۔ اسے منیر لکھنوی نے مرتب کیا تھا اور یہ پہلی بار ۱۹۳۰ء میں کان پور سے مطبع مجیدی کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ کتاب زیادہ ضخیم نہیں ہے اور اس کے صرف اسی (۸۰) صفحات ہیں۔ اس میں بعض فحش الفاظ و معنی بھی شامل کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں بعض شعرا، مثلاً جان صاحب، نواب مرزا [شوق]، محشر، بے خود وغیرہ، کی اسناد بھی دی ہیں لیکن بیش تر اسناد جان صاحب کے کلام سے ہیں۔

ابتدائی ستر (۷۰) صفحات کے بعد "خاص محاوراتِ بیگمات" کے زیر عنوان مزید دس (۱۰) صفحات ہیں۔ البتہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ الگ تقطیع کیوں قائم کی گئی ہے۔ مولف کے دیباچے میں بھی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ البتہ دیباچے میں یہ ضرور کہا ہے کہ اس لغت میں "وہ محاورات درج ہیں جو مستورات کی زبان پر بیش تر اور مردوں کی زبان پر کم تر آتے ہیں"۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ دوسرے حصے میں وہ الفاظ و محاورات درج ہوں گے جو صرف خواتین بولتی ہیں لیکن بعض اندراجات دونوں حصوں میں موجود ہیں۔ لیکن بہر حال اہم کام ہے۔

☆محاوراتِ نسواں (۱۹۳۶ء؟)

اسی عنوان یعنی "محاوراتِ نسواں" کے تحت منیر لکھنوی کے علاوہ خواتین کی زبان کی ایک لغت وزیر بیگم ضیا نے بھی مرتب کی تھی۔ عبدالمجید سالک کی تقریظ کے مطابق مولفہ کا تعلق پنجاب سے تھا، اگرچہ اس میں انھوں نے تقریباً چالیس (۴۰) کتابوں سے مدد لی جس کا فراخ دلی سے اعتراف بھی کیا ہے۔ شعرا کے کلام سے اسناد اس کے علاوہ ہیں۔ مولفہ نے دیباچے کے بعد محولہ کتابوں کی فہرست بھی دی ہے اور شکریہ ادا کر کے لکھا ہے کہ اس لغت میں "بعض محاورات ایسے بھی دیے گئے ہیں جو آج تک کسی دوسری لغت میں درج نہیں ہوئے"۔ اور بقول ان کے اس میں عورتوں کے الفاظ و محاورات کے علاوہ بعض توہمات سے متعلق الفاظ بھی شامل ہیں۔

مولفہ کا دیباچہ بعنوان "عرضِ حال" ۱۹۳۶ء کا ہے اور آخر میں دیے گئے دو قطعاتِ تاریخ سے بھی اس کا سالِ تصنیف ۱۳۵۵ ہجری (۱۹۳۶ء) نکلتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن علمی پرنٹنگ پریس (لاہور) سے شائع ہوا جس میں شامل ایک تقریظ کے مطابق اس دوسرے ایڈیشن

میں اضافے بھی کیے گئے تھے۔ پہلا ایڈیشن کم یاب ہے لیکن دوسرے ایڈیشن میں شامل بعض آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء کے اوائل میں یا اس سے قبل شائع ہو چکا تھا لیکن راقم کی نظر سے پہلا ایڈیشن نہیں گزرا۔

''عرض حال'' کے تحت مولفہ لکھتی ہیں کہ:

کلکتے میں منعقدہ ایک خواتین کانفرنس میں بیگم محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ ''ہماری زبان اردو جو ایک یتیم لڑکی کی طرح، جس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو، دلّی کے بازاروں میں آوارہ پھر رہی تھی۔ قلعہ معلیٰ کی بیگمات اور شہزادیوں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اپنے آنچلوں کے سائے میں پرورش کر کے اسے پروان چڑھایا کہ مردوں کی نظریں بھی اس پر پڑنے لگیں اور انھوں رفتہ رفتہ فارسی کو ترک کر کے اس زبان کو منہ لگانا شروع کیا۔ چونکہ پرورش اس کی عورتوں کی ہی گود میں ہوئی تھی اس لیے محاورات کے لحاظ سے ہمیشہ عورتوں کی ہی زبان ٹکسالی سمجھی گئی... عورتوں کی زبان کا مردوں کے لیے اختیار کرنا اس قدر مشکل تھا کہ بڑے بڑے شاعر بھی اسے نباہ نہ سکے۔ بلاشبہ ریختی گویوں نے اپنی ریختی میں عورتوں کا منہ چڑانے کی ضرور کوشش کی ہے لیکن جو محاورات ان کی زبان پر چڑھے وہ سراسر بازاری تھے۔ میں کافی اخلاقی جرأت سے کام لے کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ مخدرات [با] عصمت کی زبان کی پیروی ریختہ گو شعرا سے بھی نہ ہو سکی''۔ (ص ۵۔۶)

ان میں سے بیشتر خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مولفہ نے اس دیباچے میں یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو کی تشکیل اردو اور ہندی کے ''ملاپ'' سے ہوئی ہے اور اس کی تشکیل میں ان ''ہندو رانیوں'' کا بڑا ہاتھ تھا جو مغل بادشاہوں کے حرم میں لے جائی گئیں (ص ۸)۔ مگر یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ اردو کی تشکیل مختلف زبانوں کے ملنے سے ہوئی ہے۔

اگرچہ اردو کے مختلف زبانوں سے مل کر بننے کا نظریہ تو غلط ثابت ہو گیا لیکن یہ ''ہندو

رانیاں'' اور ان کا ''ملاپ'' وحیدہ نسیم کے ذہن پر سوار ہوگیا جنھوں نے بعد میں اس کتاب اور اس نظریے سے اپنی کتاب ''عورت اور اردو زبان'' میں خاصا استفادہ کیا لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کتاب میں کئی کتابوں کے نام بطور حوالہ موجود ہیں اور ان سے بھی وحیدہ نسیم کو بڑی مدد ملی ہوگی لیکن ان کا بھی ذکر وحیدہ نسیم کی کتاب میں نہیں ملتا (اس کا ذکر آگے آرہا ہے)۔

اگرچہ وزیر بیگم ضیا نے اس لغت میں کئی مقامات پر اشعار بھی بطور سند پیش کیے ہیں لیکن ریختی میں مستعمل الفاظ کی فہرست کے برعکس یہ مہذب اور شریفانہ ذخیرۂ الفاظ پر مبنی لغت ہے۔

☆ زبانِ زنانِ دہلی (۱۹۵۹ء)

شبیر علی کاظمی کی مرتبہ لغت ''زبانِ زنانِ دہلی'' کتابی صورت میں ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ یہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے رسالے ''اردو'' (کراچی) کے جولائی ۱۹۵۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دہلی کی خواتین زبان اور اس کے الفاظ پیش کیے گئے ہیں۔

☆ عورت اور اردو زبان (۱۹۶۲ء)

وحیدہ نسیم کی کتاب ''عورت اور اردو زبان'' کا قصہ بھی عجیب ہے۔ مصنفہ نے اردو زبان اور خواتین سے متعلق تاریخی اور تحقیقی مواد تیار کرلیا تھا اور خواتین کے الفاظ اور محاورات کی لغت بھی ضمیمے کے طور پر تیار کرلی تھی لیکن کوئی ناشر نہ ملا۔ مجبوراً اسے انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ایک ادبی رسالے ''انتخاب نو'' میں چھپوادیا۔ اس کے بعد وہ اس کی کتابی صورت میں اشاعت کی کوشش کرتی رہیں لیکن ۱۹۶۶ء میں انھیں اطلاع ملی کہ ان کی کتاب، جو بغیر لغت کے تھی اور صرف تحقیقی اور تاریخی حصے پر مشتمل تھی، ہندوستان سے شائع ہوگئی ہے۔ یہ غالباً انتخاب نو سے لیے گئے مواد پر مبنی تھی۔

آخرِ کار غضنفر اکیڈمی (کراچی) نے ۱۹۷۹ء میں اس کا ایک ایڈیشن مکمل صورت میں یعنی دونوں حصوں سمیت (تحقیق اور لغت) شائع کردیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن اسی ادارے نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۸۷ء میں موڈرن پبلشنگ دہلی نے شائع کیا تھا اور ایک سو بیالیس (۱۴۲) صفحات کے اس ایڈیشن میں صرف لغت کا متن اور ایوب قادری کا چند صفحات پر مبنی تعارف'' شامل تھا اور اس ایڈیشن میں مصنفہ کی ابتدائی ''تحقیق'' شامل نہیں تھی۔

کتاب بہت محنت سے مرتب کی گئی ہے اور بعض نازک مقامات سے بھی مصنفہ کامیابی اور نفاست سے اشاروں کنایوں میں بات کر کے گزر گئی ہیں۔ البتہ ابتدائی حصے میں اردو زبان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انھیں مغالطہ ہوا اور انھوں نے ''ہندورانیوں'' اور مغل بادشاہوں کے ''ملاپ'' سے اردو کی ''پیدائش'' کا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ دیباچے میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کتنے ادبی اداروں کے در کھٹکھٹانے اور کتنی بڑی ادبی شخصیات کے ناپید جذبۂ ترحم کو آواز دینے کے بعد وہ اس کتاب کی اشاعت سے مایوس ہو گئی تھیں کیونکہ، بقول ان کے، کوئی تو ان کا پی ایچ ڈی کا گائیڈ بننا چاہتا تھا، کسی ادارے کے پاس وسائل نہ تھے اور کسی کو ''ہندورانیوں'' کے مسلمانوں سے ''ملاپ'' پر اعتراض تھا۔ لہٰذا ان سے کہا گیا کہ ان ''ہندورانیوں'' کو کتاب کے ابتدائی تحقیقی حصے سے نکال دیا جائے تو کتاب چھپ سکتی ہے۔ لیکن بقول مصنفہ کے یہ ہندورانیاں اور ان کا ملاپ اور اس ملاپ سے پیدا ہونے والی زبان اردو تو ''تاریخی حقیقت'' ہے، بھلا حقیقت کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے اور پھر مصلحت سے کام لیا جائے تو تحقیق کیا ہوئی؟ وغیرہ۔

ہمیں ہندورانیوں اور ان کے ''ملاپ'' پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اردو کی پیدائش کا یہ نظریہ گمراہ کن اور غیر سائنسی ہے۔ نہ تو یہ تاریخ ہے اور نہ لسانیات سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ زبانیں اس طرح بنتی نہیں ہیں۔ بلکہ اردو کے لشکری زبان ہونے کا نظریہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے اور وہ بھی اتنا ہی غیر تحقیقی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس ''تاریخی حقیقت'' اور ''تحقیق'' کا کوئی ٹھوس ثبوت یا معتبر و مستند حوالہ وہ نہیں دے سکی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے جس طرح تفصیل سے عورتوں کی مخصوص زبان کا پس منظر پیش کیا ہے اس طرح کی تفصیلی اور مبسوط کتاب اس موضوع پر کوئی نہیں تھی اور اس سے قبل اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں زیادہ زور الفاظ کی فہرست پر تھا اور اگر پس منظر یا تحقیقی و تنقیدی گفتگو تھی بھی تو بہت مختصر اور سرسری تھی۔

بہر حال، خواتین کی زبان اور الفاظ و محاورات پر مصنفہ کی محنت قابلِ داد ہے۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اردو میں پہلی بار انھوں نے یہ کام کیا ہے۔ انھوں نے پچھلی کتابوں سے، بالخصوص وزیر بیگم ضیا سے خاصا ''استفادہ'' کیا ہے اگرچہ ان کے حوالے نہیں دیے۔ کچھ کتابوں کے حوالے ضرور ہیں مگر وہ بیشتر تاریخی مواد ہے اور ان میں بھی بعض حوالے سرسری اور نامکمل ہیں۔

کچھ حوالے غیر معتبر ہیں، مثلاً نواب نصیر حسین خیال کی کتاب ''مغل اور اردو'' کا حوالہ دیا ہے (ص ۲۸)۔ لیکن یہ صاحب کچھ زیادہ معتبر محقق نہیں سمجھے جاتے۔ بلکہ شاید انھیں محقق تسلیم کرنے میں بھی بعض لوگوں کو تامل ہو۔

لیکن کئی مقامات پر جہاں اشعار کی سند دی گئی ہے وہاں ''استفادہ'' صاف ظاہر ہے کیونکہ اسی شاعر کا وہی شعر کسی لفظ کے معنی واستعمال کی سند کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اس موضوع پر تالیف کی گئی دیگر کتابوں میں موجود ہے لیکن نہ تو اصل ماخذ (دواوین) کا راست حوالہ دیا گیا ہے اور نہ ''بحوالہ'' لکھ کر استفادے کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اشعار کی سند کے ضمن میں مطبوعہ نسخے، ایڈیشن اور صفحہ نمبر کا بھی حوالہ نہیں دیا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسناد گزشتہ کتابوں سے اکٹھی کی گئی ہیں۔ بہر حال یہ ایک تفصیلی اور مفید کام ہے اور مصنفہ نے خود بھی خواتین کے زیر استعمال نئے اور نادر الفاظ ومحاورات غالباً ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر پیش کیے ہیں۔ البتہ حوالوں سے اس کتاب کا اعتبار بڑھ جاتا۔

اس میں تقریباً تین ہزار الفاظ، محاورات اور کہاوتیں وغیرہ ہیں۔ تشریح بھی اکثر بہت بہتر ہے۔ دراصل لغت نویسی کا سب سے اہم اور مشکل مرحلہ تشریح نویسی ہی ہے جس میں بڑے بڑے ڈگمگا جاتے ہیں اور مترادف یا گول مول باتوں کو تشریح سمجھ لیا جاتا ہے۔ بعض نئے اندراجات کے ساتھ سند کے طور پر اشعار بھی دیے ہیں۔ گو ان کی تعداد کم ہے اور وہ بطور ''استفادہ'' ہی آئے ہیں لیکن اس سے لغت کے اعتبار اور قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

☆ دلّی کی بیگماتی زبان (۱۹۷۶ء)

حسن الدین احمد کی کتاب ''دلی کی بیگماتی زبان'' صحیح معنوں میں لغت نہیں ہے بلکہ عورتوں کی زبان پر تحقیق ہے جس میں الفاظ، محاورات، فقرے، مرکبات اور کہاوتیں بھی آ گئی ہیں۔ مصنف علامہ حیرت بدایونی کے صاحب زادے اور جیلانی بانو کے بھائی ہیں اور لسانی موضوعات پر ان کے دیگر مطبوعہ کام بھی موجود ہیں۔

درحقیقت یہ کتاب عورتوں کی مخصوص زبان پر ایک وقیع علمی کام ہے اور فرہنگ یا لغت نہ ہونے کے باوجود اس میں اتنے اور ایسے الفاظ آ گئے ہیں اور ان کی تشریح اور پس منظر بھی آ گیا ہے

کہ یہ لغت سے بڑھ کر ایک کام بن گیا ہے۔ اس میں بعض ایسا مواد، مثلاً الفاظ، مرکبات، عورتوں کا روزمرہ، فقرے، لوریاں، پہیلیاں، استعارے، تلمیحات، توہمات اور ان سے متعلق الفاظ مع پس منظر، رسوم ورواج اور ان کا تناظر مع الفاظ، کوسنے، دیہاتی گیت، کھانوں کے نام، زیورات کے نام، رنگوں کے نام، اور ثقافتی پس منظر دیا گیا ہے، جو لغت نویسوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ بلکہ بعض الفاظ، کوسنے، دعائیہ کلمات، روزمرہ اور مرادی معنی بعض لغات میں بھی نہیں ملیں گے۔ مثلاً پان پھول یعنی برائی اچھائی؛ گنگا جمنی یعنی روپہلا اور سنہری۔

کتاب میں خواتین کے زیر استعمال جو مخصوص الفاظ ومحاورات پیش کیے گئے ہیں، وہ بیش تر دلی کے لال قلعے اور شاہی خاندان یا آس پاس کے محلوں کی زبان سے متعلق ہیں۔ قلعے کی اس بیگماتی زبان میں موجود الفاظ جو توہمات، عقائد ورسوم کو بیان کرتے ہیں ان کا پس منظر بھی اس کلچر کا آئینہ دار ہے جو ہندوستان میں مغلیہ دور میں پروان چڑھا۔ آخر میں ''بیگماتی اردو'' لکھنے والے چند ادیبوں کی تحریروں کے اقتباس بھی دیے گئے ہیں۔ غرض ایک سو پندرہ (۱۱۵) صفحوں کی کتاب میں بہت کچھ سمو دیا گیا ہے۔ نئی آواز (جامعہ نگر، دہلی) سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔

☆ دلی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے (۲۰۰۵ء)

خواتین کی زبان کی مرتبہ لغات میں یہ غالباً سب سے کم زور کتاب ہے۔ مولفہ کو کہاوت اور محاورے کا فرق نہیں معلوم کیونکہ کتاب کے دو حصے ہیں اور ایک پر محاورات اور دوسرے پر کہاوتیں کی سرخی جمائی گئی ہے لیکن دونوں حصوں میں کہاوتیں اور محاورے موجود ہیں۔ اس تقسیم کی کوئی بنیاد بھی نہیں بتائی گئی۔ قاری یہ سوچتا ہے کہ پھر اس تقسیم کی کیا ضرورت تھی (ویسے یہ فرق تو آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے بلکہ پروفیسر قسم کے حضرات کو بھی نہیں معلوم)۔

کتاب اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی اور ستم یہ ہے کہ بہت مقبول ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

حواشی:

۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ایڈورڈ فنیگن، (Edward Finegan)، Language : Its

Structure and Use (اور لینڈو: ہارکوٹ بریس اینڈ کمپنی، ۱۹۹۹ء)،ص ۳۷۱-۳۷۰[تیسرا ایڈیشن]؛
نیز آر،ایل ٹراسک(R.L.Trask)، Language: the Basics (لندن: روٹلیج، ۲۰۰۴ء)،
ص ۹۲-۹۱،۷۲،۷۱[دوسرا ایڈیشن]۔

۲۔ٹراسک،محولہ بالا،ص ۹۲ وبعدہٗ۔

۳۔جارج یول (George Yule) ، The Study of Language،(کیمبرج: کیمبرج یونی
ورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء)،ص ۲۴۲-۲۴۱[دوسرا ایڈیشن]۔

۴۔ایضاً،ص ۲۴۰۔

۵۔ایضاً،ص ۲۴۲۔

۶۔ٹراسک،محولہ بالا،ص ۸۴۔

۷۔تفصیلات:وحیدہ نسیم،عورت اور اردو زبان(کراچی:غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۳ء)،بالخصوص باب پنجم و باب ہفتم،
[دوسرا ایڈیشن]۔

۸۔ایضاً۔

۹۔ایضاً،بالخصوص باب ہفتم میں ملاحظہ ہوں الفاظ زیر عنوان: کنائے بوجہ توہم پرستی اور کنائے بوجہ شرم وحیا۔

۱۰۔ایضاً۔

۱۱۔ایضاً،ص ۹۴۔

ماخذ:

۱۔ٹراسک،آر،ایل (Trask, R,L)، Language: the Basics ، لندن:روٹلیج، ۲۰۰۴ء
[دوسرا ایڈیشن]۔

۲۔فنیگن،ایڈورڈ (Finegan, Edward)، Language :Its Structure and Use،
اور لینڈو: ہارکوٹ بریس اینڈ کمپنی، ۱۹۹۹ء[تیسرا ایڈیشن]

۳۔نسیم،وحیدہ،عورت اور اردو زبان۔کراچی:غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۳ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۴۔یول،جارج (Yule, Georg) ، The Study of language،(کیمبرج: کیمبرج یونی
ورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء [دوسرا ایڈیشن]۔

ضرب المثل اور اردو میں ضرب الامثال کی لغات

ضرب المَثَل کی تعریف یا تعارف سے پہلے یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ''مَثَل'' کا تلفظ میم (م) اور ثے (ث) پر زبر کے ساتھ ہے (یعنی مَ ثَ ل) لیکن بعض حضرات کو ہم نے اس کا تلفظ ''مِثْل'' (اور ''ضرب المِثْل'') یعنی میم (م) کے نیچے زیر اور ثے (ث) ساکن (یعنی مِ ث ل) کے ساتھ کرتے سنا ہے جو بالکل غلط ہے۔ مِثل (میم مکسور، ث ساکن) ایک الگ لفظ ہے جس کے معنی ہیں نظیر، مثال اور اس کے دوسرے معنی ہیں ہم سر، ہم رتبہ[۱]۔ جبکہ مَثَل (بفتحین) سے مراد ہے، کہاوت، مقولہ جسے ضرب المَثَل بھی کہا جاتا ہے[۲]۔ اس کی جمع ضرب الاَمثال ہے۔ گویا ضرب الامثال کے معنی ہیں کہاوتیں۔

☆ کہاوت یا ضرب المَثَل کیا ہے؟

افسوس کہ آج پڑھے لکھے لوگ بھی کہاوت اور محاورے میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ کہاوت یا ضرب المثل کی تعریفیں مختلف مآخِذ میں ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ ملتی ہیں، مثلاً The Oxford Encyclopedic English Dictionary نے proverb یعنی کہاوت کی یہ تعریف دی ہے:

proverb: a short pithy saying in general use, held to embody a general truth.

اس کا مفہوم کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

> کہاوت ایک ایسا مختصر اور پُر مغز جملہ یا فقرہ ہوتا ہے جو عام استعمال میں ہوتا ہے اور جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں عمومی صداقت موجود ہے[۳]۔

یونس اگاسکر نے مختلف مآخذات سے کہاوت کی تعریف اور مفہوم لکھنے کے بعد اس پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ ''کہاوت قدما کے طویل تجربات ومشاہدات کا نچوڑ وہ دانش مندانہ قول ہے جس میں کسی کی ذہانت نے زورِ بیاں پیدا کیا ہو اور جسے قبول عام نے روزمرہ زندگی کا کلیہ بنادیا ہو''۔[۴]

یہ ایک بہتر تعریف ہے لیکن اس میں بھی کہاوت کی بعض خصوصیات نہیں آسکی ہیں۔ دراصل کہاوت کی تعریف پر ماہرین کی بہت طویل بحثیں موجود ہیں اور یہ ارسطو سے لے کر آج تک جاری ہیں[۵]۔ ان بحثوں کی تفصیل میں جائے بغیر عرض ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں کہاوتیں ہوتی ہیں اور کہاوتوں کا مطالعہ کرنا اور ان کی وضاحت اور جمع آوری ایک قدیم علمی سرگرمی ہے۔ یہ موجودہ دور میں ایک باقاعدہ علم کا درجہ رکھتا ہے اور انگریزی میں اس کا ایک باقاعدہ نام بھی ہے۔ کہاوتوں کی جمع آوری اور مطالعے کو انگریزی میں paremiology کہا جاتا ہے۔ اسے ہم اردو میں مَثَل شناسی کہہ سکتے ہیں نیز کہاوتوں کے لکھنے اور ان کی تشریح کے عمل کو انگریزی میں paremiography کہتے ہیں۔ اس کا اردو مترادف مَثَل نگاری ہو سکتا ہے۔

وولف گینگ میڈر (Wolfgang Mieder) کا کام کہاوت کے ضمن میں پوری دنیا میں معروف ہے اور اس نے اپنے گزشتہ کاموں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی ۲۰۰۴ء کی مطبوعہ کتاب میں کہاوت کی یہ تعریف دی ہے[۶]:

> a proverb is a short, generally known sentence of the folk which contains wisdom, truth, morals and traditional views in a metaphorical, fixed and memeorizable form and which is handed down from generation to generation.

میڈر کی اس عبارت کا مفہوم کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

> ''کہاوت طے شدہ اور قابلِ حفظ الفاظ میں بیان کردہ ایک ایسا مختصر اور معروف عوامی جملہ ہوتا ہے جس میں دانش، سچائی، اخلاقی تعلیم اور روایتی نقطۂ نظر استعاراتی انداز میں پائے جاتے ہیں اور جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہے''۔

یہ تعریف جامع ہے اور اس میں کہاوت یا مثل کی اہم خصوصیات بیان ہوگئی ہیں، جس کے نمایاں نکات یہ ہیں:

۱۔ کہاوت مختصر ہوتی ہے۔

۲۔ کہاوت عام طور پر معروف ہوتی ہے یعنی زباں زدِ خاص و عام ہوتی ہے۔

۳۔ کہاوت کی بنیاد لوک یا عوامی ہوتی ہے۔

۴۔ کہاوت میں عقل و دانش، صداقت، اخلاقیات اور روایتی احساس و نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔

۵۔ کہاوت استعاراتی انداز میں بھی ہوسکتی ہے۔

۶۔ کہاوت کے الفاظ مقررہ یا طے شدہ ہوتے ہیں، گویا ان میں ردو بدل جائز نہیں۔

۷۔ کہاوت کے الفاظ کی ترتیب یا نشست و برخاست ایسی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور یاد رہ جاتے ہیں۔

۸۔ کہاوت نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔

بعض مصرعے بھی اسی لیے کہاوت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان میں عمومی سچائی ہوتی ہے اور وہ کسی خاص صورت حال یا واقعے کے کسی خاص پہلو یا سبق کی وضاحت کرتے ہیں۔ اردو کے سینکڑوں مصرعے اسی لیے تحریر و تقریر میں استعمال کر لیے جاتے ہیں کہ وہ کہاوت بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

کہاوت نہ صرف دانش و حکمت لیے ہوئے ہوتی ہے بلکہ رسوم و رواج اور سماجی رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اردو کی بعض قدیم کہاوتوں کے الفاظ اور بعد کے ادوار کی کہاوتوں کی زبان کے مطالعے سے اس لسانی تغیر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کہاوتوں کا مطالعہ لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے بھی اہم ثابت ہوسکتا ہے۔ یونس اگاسکر نے کہاوتوں کا سماجی مطالعہ پیش کیا ہے لیکن اردو کہاوتوں کا تفصیلی لسانی اور لسانیاتی مطالعہ بھی اہمیت اور دل چسپی کا حامل ہوگا۔

☆ کہاوت اور محاورہ

اکثر پڑھے لکھے لوگ بلکہ بعض پروفیسر نما حضرات بھی محاورے اور کہاوت میں فرق

روانہیں رکھتے اور وہ تقریر اور تحریر میں کہاوت کو بھی محاورہ کہہ دیتے ہیں۔محاورے کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ:

ا۔محاورہ مجازی معنی میں ہوتا ہے۔

۲۔محاورے میں مصدر کا ہونا لازمی ہے۔

۳۔محاورہ کم از کم دو الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے، مثلاً دل جلنا، آنکھیں چار ہونا، دل میں لڈو پھوٹنا، خون کے گھونٹ پینا۔

محاورے کو انگریزی میں idiom کہتے ہیں اور کہاوت یا ضرب المثل کے لیے انگریزی میں مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مثلاً maxim, adage proverb, saying, وغیرہ۔

کہاوت یا ضرب المثل حقیقی معنوں میں ہوتی ہے اور کبھی مجازی معنوں میں یا استعاراتی انداز میں بھی آتی ہے لیکن اس میں مصدر اس طرح نہیں آتا جیسے محاورات میں، مثلاً ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں اور یہ منہ اور مسور کی دال وغیرہ کہاوتیں ہیں۔

☆ اردو میں ضرب الامثال کی لغات اور فرہنگیں

انگریزی لغات میں کہاوتوں کا اندراج نہیں ہوتا لیکن اردو لغات میں کہاوتیں بالعموم لازمی سمجھی جاتی ہیں اور اردو کی تقریباً تمام اہم اور ضخیم لغات میں کہاوتیں یا ضرب الامثال مع مفہوم مندرج ہیں۔اردو میں کہاوتوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔شاید اسی لیے اردو میں کہاوتوں کی لغات یا فرہنگیں الگ سے بھی لکھی گئی ہیں۔ان میں اردو بہ اردو لغات کے علاوہ فارسی بہ اردو اور انگریزی بہ اردو لغات بھی ہیں جن میں دو زبانوں کی باہم مترادف یا ہم معنی کہاوتیں درج ہیں۔یہاں کہاوتوں یا ضرب الامثال کی اردو بہ اردو لغات کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔ البتہ بعض ناشرین نے تجارتی مقاصد کے تحت اردو کہاوتوں کی کچھ لغات شائع کی ہیں جن کی اچھی خاصی تعداد ہے لیکن ان کے غیر معیاری ہونے کی وجہ سے انھیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

☆ ا۔خزینۃ الامثال (۱۸۰۱ء۔۱۸۰۰ء)

یہ اردو میں کہاوتوں کی پہلی لغت ہے۔اس میں اردو، عربی اور فارسی کی کہاوتیں الگ الگ ابواب کی صورت میں درج کی گئی ہیں۔اسے شاہ حسین حقیقت (۱۸۳۳ء۔۱۷۷۲ء) نے

۱۲۱۵ ہجری (۰۱-۱۸۰۰ء) میں مرتب کیا تھا۔ لیکن اسے شائع ہونے میں خاصا عرصہ لگا اور اسے لکھنؤ سے مطبع مصطفائی نے ۱۲۷۰ ہجری (۱۸۵۳ء) میں پہلی بار شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن لکھنؤ کے معروف اشاعتی ادارے نول کشور نے ۱۸۷۲ء میں شائع کیا۸۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا عکس مقتدرہ قومی زبان نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔

خزینۃ الامثال کے نول کشوری ایڈیشن کے دیباچے سے ظاہر ہے کہ اسے عبدالرحمٰن شاکر نے مرتب کیا تھا اور اس پر اس دور کی اہم علمی شخصیت مولانا رکن الدین محمد (جو مولوی تراب علی کے نام سے معروف تھے) نے نظر ثانی کی اور عربی کی کہاوتوں کا ترجمہ بھی کیا اور حواشی بھی لکھے۹۔

خزینۃ الامثال میں اردو کہاوتوں کی تعداد خاصی ہے اور اس میں بعض ایسی بھی ہیں جو دیگر لغات میں نہیں۔ ایک اہم بات اس کتاب کی یہ ہے کہ اس کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں پہلے فارسی میں ایک تحریر مزاح کے مستحب ہونے کے موضوع پر ہے اور اس کا عنوان ''مقدمہ در بیانِ استحبابِ مزاح'' ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مطائبات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سجایا۱۰ وشمائل میں شامل تھے اور بقول ان کے احادیث اور روایات سے ثابت ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ ازواج مطہرات اور اصحابِ کبار سے شائستہ اور پاکیزہ مزاح فرمایا کرتے تھے [جس میں کسی کی کسی قسم کی دل آزاری یا غیر مباح چیز کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا]۔ انھوں نے اس سلسلے میں کچھ واقعات بھی لکھے ہیں۔ اس کے بعد کچھ مزید پُر مزاح واقعات، لطائف وظرائف بھی پیش کیے ہیں جو مختلف لوگوں سے متعلق یا ان سے منسوب ہیں۔ یہ تحریر فارسی میں ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ کہاوتوں سے اس حصے کو کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔

اس ضمیمے کا دوسرا حصہ ''دربیانِ کنایات و مصطلحاتِ فارسی'' کے عنوان سے ہے اور اس میں فارسی شعروادب میں مستعمل کنایات کی الف بائی ترتیب سے وضاحت کی ہے کہ ان سے کیا مراد ہے۔ یہ بھی زبان وادب کے طالب علم کے لیے اہمیت رکھتا ہے مگر ضرب الامثال سے اس کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد بعض فارسی الفاظ سے متعلق معنی کی بحث ہے یہ بھی الف بائی ترتیب میں ہے اور اس کا بھی کہاوتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس ضمیمے کا چوتھا اور آخری حصہ بعض غلط العام الفاظ کی تصحیح سے متعلق ہے۔ انتہائی اہم اور مفید کام ہے۔

☆۲۔ نجم الامثال (۱۸۷۶ء)

اس نام سے مولوی محمد نجم الدین نے اردو کی کہاوتوں کا مجموعہ مرتب کیا۔ لیکن یہ دراصل ایک سلسلے کا پانچواں حصہ تھا جس کا عنوان ''اردو زبان دانی'' تھا۔

مولوی ظفر الرحمن دہلوی کے مطابق نجم الامثال پہلی بار ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ ہجری میں شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ ہجری میں طبع ہوا [۱۱]۔ تیسرے ایڈیشن کی اطلاع بھی انھوں نے دی ہے اور بتایا ہے کہ ''طبع سوم مطبع احمدی، لاہور'' [۱۲]۔ البتہ تیسرے ایڈیشن کا سال اشاعت انھوں نے نہیں دیا۔

اس کے ۱۸۸۸ء کے ایڈیشن کا ایک نسخہ راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ چونکہ یہ ایک کم یاب ایڈیشن ہے لہٰذا اس کی لوح کی عبارت، مع انگریزی تحریر، من وعن یہاں پیش کی جارہی ہے (اگرچہ بعض اردو الفاظ کا املا نامانوس ہے لیکن اسے یہاں برقرار رکھا گیا ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ ملا کر لکھے گئے ہیں اور یہ قدیم انداز اور املا بھی یہاں ہو بہو برقرار رکھا گیا ہے):

NAJM-UL-AMSAL

VOL V

OR

A collection of 4,000 oriental Proverbs

with their proper application and

explanatory fables

BY

MAULAWI MOHAMMAD NAJMUDDIN

Mathemetical Master of the Anglo

Arabic School

DELHI

نجم الامثال

یعنے

اردو زباندانی کا پانچواں حصہ

جسمیں ہندوستانی چار ہزار ضرب الامثال مع شرح اور قصص فراہم کی گئیں ہیں

مصنفہ

مولوی محمد نجم الدین صاحب مدرس ریاضی اینگلو عربی سکول دہلی

۱۸۸۸ء

مطبع احمدی میں احمد حسن خاں صاحب کے اہتمام سے چھپی

کتاب رجسٹری شدہ ہے جس پر مصنف کی مہر نہووہ مسروقہ ہے

تیسری دفعہ ۱۰۵۰ جلد 3rd Edition 1050

(اس سے اگلی سطر جلد ساز کی کٹائی کی زد میں آنے کی وجہ سے پڑھی نہ جا سکی)

ابتدا میں مولف کا دیباچہ ہے جس میں اپنے والد کا نام محمد عزیز الدین بتایا ہے اور اپنے دادا محمد وارث الدین ''المخاطب بہ زمرد رقم خاں بہادر'' کو عالم گیر ثانی کا استاد لکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کو اپنا جدِ امجد کہا ہے۔ پھر اردو زبان کی تاریخ مختصراً بیان کرتے ہوئے اس کو لشکری زبان بتایا ہے [جو ظاہر ہے کہ غلط ہے][۱۳]۔ کتاب کی تالیف کی وجہ بھی بتائی ہے کہ ''طلباءِ مدارس'' اور ''عام شائقین'' کے لیے کوئی ایسی کتاب دست یاب نہیں ہے ''جس میں تمام اردو زبان کے لغات اور روزمرہ اور برتاو کے محاورے اور اصطلاحات اور امثال'' موجود ہوں، چنانچہ انھوں نے اس ''اہم کام کا بیڑا اٹھایا''[۱۴]۔

بقول مولف چونکہ اس سارے کام کو ایک دفعہ چھپوانا بھی دشوار تھا اور ''خریداروں کی ہمت کا حال معلوم'' تھا اس لیے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان پانچ حصوں کی تفصیل مولف نے یوں بیان کی ہے:

پہلے حصے میں ''لغات و محاورات در مصطلحات اور اور روزمرہ مع اسناد''، دوسرے حصے میں ''اصطلاحیں ہر پیشہ ور کی''، تیسرے حصے میں ''پہلیاں، مکرنیاں، انملیاں، دوسخنے، دوہے، کبت، گیت''، چوتھے حصے میں ''محاوراتِ عامہ عورات و اصطلاحاتِ بیگمات''، پانچویں حصے میں ''کئی

ہزار ضرب الامثال یعنی کہاوتیں"۱۵۔

اس تیسرے ایڈیشن میں لغت کے تین سو دس صفحات ہیں اور ۳۱۱ تا ۳۱۷ پر تقریظیں اور تعریفی تبصرے دیے گئے ہیں جو ۱۸۷۶ء میں مختلف مطبوعات مثلاً اخبار انجمنِ پنجاب اور پنجابی اخبار (لاہور) میں پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد شائع ہوئے تھے۔ صفحہ ۳۱۸ تا ۳۲۰ ان کتابوں کے اشتہار پر مبنی ہیں جو اس ادارے نے شائع کی تھیں۔ ان میں مولف مولوی نجم الدین کی بعض درسی کتب مثلاً نجم الحساب کے علاوہ اردو زبان دانی کے سلسلے کی پانچ کتابوں کے بھی نام درج ہیں جو یہ ہیں: نجم اللغات، مصطلحاتِ نجمیہ، نجم الکلام، ریختی نجمیہ، نجم الامثال۔ ان کے علاوہ ایک چھٹی کتاب نجم المحاورات کا بھی ذکر ہے جس میں اس اشتہار کے مطابق اردو محاورے اور ان کی شعری اسناد دی گئی ہیں۔ ایک اور قابل ذکر کتاب اس میں نجم الآثار بھی ہے جو بقول ان کے "اردو کورس" ہے جس میں نظم و نثر کے علاوہ "مشکل مقامات کی شرح اور لغات کی تشریح" بھی دی گئی ہے ۱۶۔ افسوس کہ ان میں سے بیشتر کتابیں اب کم یاب اور کچھ نایاب ہیں۔

نجم الامثال کے ۱۸۸۸ء کے ایڈیشن میں پہلا اندراج "آب آب کر مر گئے سرہانے دھرا رہا پانی" کا ہے جبکہ آخری اندراج "یہ وہ گڑ نہیں جو مکھیاں کھائیں" کا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے "تمت تمام شد بالخیر والعافیت در سنہ ۱۳۰۶ ہجری نبوی" جس کی مطابقت ۱۸۸۸ء سے ہوتی ہے۔

اس کا چوتھا ایڈیشن لاہور سے ۱۹۲۵ء میں پیسہ اخبار لاہور نے "باخذِ حقوق" شائع کیا۔ چوتھے ایڈیشن میں صفحات بڑھ کر ۳۷۱ ہو گئے، البتہ پہلا اور آخری اندراج وہی رہا۔ نجم الامثال میں کم و بیش چار ہزار کہاوتیں شامل ہیں۔

☆۳۔ A Dictionary of Hindustani Proverbs (۱۸۸۴ء)

"اے ڈکشنری اوف ہندوستانی پرووربس" معروف لغت نویس ایس ڈبلیو فیلن (S.W.Fallon) (۱۸۱۷ء۔۱۸۸۰ء) کی تالیف ہے۔ لیکن اس کی اشاعت اس کے انتقال (۱۸۸۰ء) کے بعد ہوئی۔ لغت کا پہلا ایڈیشن آر۔سی۔ٹیمپل (R.C.Temple) اور لالہ فقیر چند ویش کی نظرِ ثانی اور تدوین کے بعد ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۶ء میں

بنارس سے چھپا ۱۷۔ اس میں اردو، بھوج پوری اور مارواڑی کے علاوہ پنجابی کی کہاوتیں بھی شامل ہیں جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے تین سو چالیس صفحات ہیں۔ اس لغت میں کہاوتوں کا مفہوم انگریزی زبان میں بیان ہوا ہے لیکن اندراجات اردو رسم الخط کی بجائے رومن حروف میں ہیں۔

اس لغت کی خاص بات یہ ہے کہ فیلن اور اس کے ہندوستانی معاونین نے اس کے مواد کی جمع آوری کے لیے دور دراز علاقوں کے سفر کیے اور مختلف علاقوں کے لوگوں سے مل کر وہاں رائج کہاوتیں اور ان کے مفاہیم جمع اور مرتب کیے۔ فیلن اور دیگر مستشرقین جس طرح عملی تحقیقی کاوشوں سے لغات کی تدوین و ترتیب کو مستند بناتے رہے ایسی کوششیں اردو کے مقامی لغت نویسوں کے ہاں کم ہی نظر آتی ہیں۔

☆۴۔ محبوب الامثال (۱۸۸۷ء)

منشی محبوب عالم کی مرتبہ اس لغت کا پہلا ایڈیشن لاہور سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔ اس کی ایک اہم اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ اس میں اردو کہاوتوں کی ہم معنی یا مترادف عربی، فارسی، پنجابی اور انگریزی کہاوتیں بھی درج ہیں جن کے لیے الگ الگ کالم بنائے گئے ہیں۔ کہاوتوں کا اندراج انگریزی حروف تہجی کی ترتیب سے ہے۔

اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۲ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ۱۸۔ اس میں ۱۸۴ صفحات میں تقریباً سات سو کہاوتیں درج ہیں۔ ابتدا میں ایک طویل مقدمہ کہاوتوں کی اصلیت، مفہوم اور خصوصیات وغیرہ کے بارے میں ہے۔

☆۵۔ مخزن الامثال (۱۸۹۰ء)

منشی چرنجی لال دہلوی کی مرتبہ یہ کتاب بالعموم دست یاب نہیں ہے اور اس کا ذکر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب ''کیفیہ'' میں کیا ہے۔ کیفی کے مطابق یہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی اور یہ بقول ان کے ''ایک چھوٹا سا رسالہ منتخب کہاوتوں'' کا ہے ۱۹۔

☆۶۔ ایشیا اور یورپ کی ضرب المثلیں (؟)

متعدد ایشائی اور یورپی زبانوں، مثلاً چینی، جاپانی، ملائی، بنگالی، کشمیری، پنجابی، پشتو،

اطالوی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، عربی، فارسی، پرتگالی اور ہسپانوی وغیرہ، کی کہاوتوں کے اردو تراجم اس میں شامل ہیں۔ اس کے تیسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ راقم کو صدر (کراچی) میں فٹ پاتھ پر لگنے والے بازارِ کتب سے دست یاب ہوا جو ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۱۹۔ کتاب مختصر ہے اور انہتر (۶۹) صفحات پر مشتمل ہے۔ مولف کا نام درج نہیں ہے۔ پہلے ایڈیشن کا سالِ اشاعت بھی معلوم نہ ہو سکا۔

☆۷۔ محاوراتِ ہندوستان (۱۹۲۴ء)

منیر لکھنوی کی مرتبہ اس لغت کا پورا نام ''ملک کی زبان المعروف بہ محاوراتِ ہندوستان'' ہے۔ یہ پہلی بار کان پور سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی ۲۰۔ اگر چہ اس کے نام سے اندازہ نہیں ہوتا لیکن اس میں کہاوتوں کی خاصی تعداد درج ہے اگر چہ ان کی مختصر وضاحت کی گئی ہے۔ گو روزمرہ اور محاورات بھی اس لغت میں درج ہیں۔

☆۸۔ گنجینۂ امثال (۳۱۔۱۹۳۰ء)

راجا راجیسور اصغر ایک ریاست کے حاکم تھے لیکن مختلف بازیوں مثلاً کبوتر بازی، بٹیر بازی اور دیگر علتوں کی بجائے علم و ادب کی طرف راغب تھے۔ لغت نویسی سے خاص دل چسپی تھی اور کثیر تعداد میں لغات اور فرہنگیں مرتب کیں (گویا ''لغت بازی'' کی لت تھی)۔ چھیالیس صفحات پر مبنی ان کی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۲۱ ہجری (۳۱۔۱۹۳۰ء) میں شائع ہوا ۲۱۔ اس میں اردو اور فارسی کی تقریباً ایک ہزار ضرب الامثال کا اندراج ہے۔ لیکن صرف کہاوتیں درج کر دی گئی ہیں اور کوئی صراحت یا تشریح نہیں کی گئی۔

☆۹۔ گنجینۂ اقوال و امثال (۱۹۳۳ء)

منیر لکھنوی نے چھوٹی بڑی کئی لغات مرتب کیں۔ ان کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن وصی اللہ کھوکھر صاحب کی مساعی اور ان کے مقدمے کے ساتھ دوبارہ شائع ہوا ہے ۲۲۔ کھوکھر صاحب کے مقدمے میں بعض اہم معلومات بھی شامل ہیں۔ کتاب میں ابتدا میں تیس کہاوتیں ان کے حکایتی پس منظر کے ساتھ درج ہیں اور اس کے بعد دو کالموں پر مبنی تقریباً دو سو صفحات پر محیط کہاوتیں مختصر سی وضاحت کے ساتھ دی گئیں ہیں۔

☆۱۰۔گلدستۂ امثال (؟)

احمد حسین خان المتخلص بہ مذاق کی مرتبہ یہ کتاب نظامی پریس (لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ سالِ اشاعت درج نہیں۔اندازہ ہے کہ آزادی سے قبل کے دور میں شائع ہوئی ہوگی۔ چھپن (۵۶) صفحات کی اس کتاب میں اردو، فارسی اور عربی کی صرف کہاوتیں درج ہیں، مفہوم یا تشریح نہیں دی گئی۔ابتدا سے صفحہ ۲۴ تک اردو، صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۸ تک فارسی اور صفحہ ۳۹ سے صفحہ ۵۷ تک عربی کی کہاوتیں دی ہیں، البتہ عربی کہاوتوں کا اردو ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے۔

☆۱۱۔قصص الامثال (۱۹۳۷ء؟)

خواجہ محمد باقر حسن قادری سہارن پوری کی اس کتاب میں تقریباً ڈھائی سو کہاوتیں اور ان کا ماخذ یا حکایتی پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ان میں کہانیاں یا معروف روایات بھی ہیں اور تمثیلی قصے بھی جو گویا کسی کہاوت کے بننے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔کتاب اس لحاظ سے مفید ہے کہ اس میں ہر کہاوت کا مفہوم یا اس کا محلِ استعمال بیان کیا گیا ہے اور کہیں کہیں انگریزی کی مترادف کہاوتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

رائل ایجوکیشنل بک ڈپو (دہلی) سے چھپی لیکن سالِ اشاعت درج نہیں البتہ مولف کی تصویر شاملِ اشاعت ہے جس پر مولف کے دست خط مع تاریخ موجود ہیں اور اس میں سال ۱۹۳۷ء درج ہے۔قیاس کہتا ہے کہ اسی سال یا ایک دو سال بعد شائع ہوئی ہوگی۔

☆۱۲۔فرہنگِ امثال (۱۹۳۷ء)

مسعود حسن رضوی ادیب کی مرتبہ اس فرہنگ میں ایسی عربی اور فارسی کہاوتوں کا اندراج مع معنی ہے جو اردو میں مستعمل ہیں۔اس میں تقریباً بارہ سو امثال کا اندراج ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا[۲۳]۔

☆۱۳۔قصہ طلب ضرب الامثال (۱۹۳۸ء)

خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی کی مولفہ اس کتاب میں کہاوتوں کے پس منظر کے طور پر ان سے منسوب کہانیاں درج کی گئی ہیں۔یہ اور بات ہے کہ ایسے قصے اکثر کہاوتوں کے بعد گھڑ لیے گئے ہیں لیکن کئی کہاوتیں واقعی حقیقی زندگی کے واقعات اور حالات سے متاثر ہو کر ہی وجود میں آئی ہیں،

اگر چہ ان کی تحقیق آج بہت مشکل ہے۔ بہر حال ان کہانیوں سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ کہاوت کا پس منظر اور اس کی علت و غایت سمجھ میں آجاتی ہے اور اس میں پوشیدہ سبق اور حکمت بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں لگ بھگ اسی (۸۰) ایسی کہاوتیں اور ان سے وابستہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۸ء میں مکتبۂ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔

☆۱۴۔ خزینۃ الامثال (۱۹۴۳ء)

اس کے مولف جلال الدین احمد جعفری نے اپنی کتاب کے لیے وہی نام منتخب کیا جو شاہ حسین حقیقت کی کتاب کا ہے۔ لیکن بہر حال مفید کام ہے اور اس میں تقریباً دو ہزار کہاوتیں مع تشریح درج ہیں۔ مکتبۂ انوارِ احمدی (الہ آباد) نے شائع کی لیکن سالِ اشاعت درج نہیں کیا۔ قیاس ہے کہ آزادی سے قبل کے دور میں شائع ہوئی۔ بعض کتبِ حوالہ میں اس کا سالِ اشاعت ۱۹۴۳ء درج ہے۔

☆۱۵۔ کہاوت اور کہانی (۱۹۷۷ء)

سیفی پریمی کی مرتبہ اس مختصر کتاب میں کہاوتوں کا تلمیحی پس منظر دیا گیا ہے[۲۴]۔ عمدہ کام ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء میں مکتبۂ جامعہ (دہلی) نے شائع کیا۔ کچھ عرصے قبل لاہور سے بھی (بلا اجازت) چھاپ دی گئی ہے۔

☆۱۶۔ جامع الامثال (۱۹۸۶ء)

اردو ضرب الامثال کی لغات میں "جامع الامثال" جامع ترین ہے۔ اس میں گزشتہ تقریباً تمام کاموں کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ چار سو چوبیس صفحات کی اس لغت میں تقریباً دس ہزار کہاوتیں اور ان کا مفہوم درج ہے۔ وارث سرہندی کی مرتبہ اس لغت پر شان الحق حقی نے نظر ثانی کی اور اسے مقتدرہ قومی زبان نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ حال ہی میں اس کا نیا ایڈیشن بھی ادارۂ فروغِ قومی زبان (سابقہ مقتدرہ) نے شائع کیا ہے۔

☆۱۷۔ اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو (۱۹۸۹ء)

اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اگر چہ ڈاکٹر یونس اگاسکر کی یہ کتاب دراصل ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے لیکن اس کے آخر میں تقریباً اسی صفحات (دو کالموں پر مبنی) ضرب الامثال کی ایک

فہرست دی گئی ہے جو بہت مفید ہے اور اس میں کئی ایسی کہاوتوں کا بھی اندراج ہے جو دیگر منابع و مصادر میں کم ملتی ہیں۔

☆۱۸۔مرقع اقوال وامثال (۱۹۹۴ء)

یہ ایک اور ضخیم کام ہے۔سید یوسف بخاری دہلوی کا تقریباً ہزار صفحات پر مبنی یہ کام اس لحاظ سے عجیب ہے کہ اس میں مرتب نے اردو، سندھی، پنجابی، پشتو، فارسی اور عربی کی کہاوتیں اور معروف اقوال جمع کر دیے ہیں۔البتہ اس میں الف بائی ترتیب کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کسی خاص کہاوت کو تلاش کرنا خاصا مشکل ہے اگرچہ ابتدا میں موضوع وار فہرست دی گئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا اور انجمن ہی سے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت چند سال قبل عمل میں آئی۔

☆۱۹۔اردو میں مستعمل عربی وفارسی ضرب الامثال (۱۹۹۶ء)

مقبول الٰہی کی مرتبہ یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) نے ۱۹۹۶ء میں شائع کی۔ مفید کام ہے اگرچہ گزشتہ کتابوں، بالخصوص مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب، سے بھرپور ''استفادہ'' کیا گیا ہے لیکن اس کا کہیں کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

☆۲۰۔کہاوتیں اور ان کا حکایتی وتلمیحی پس منظر (۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے تقریباً پانچ سو کہاوتوں کا تلمیحی وحکایتی پس منظر اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔عمدہ کام ہے۔خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ) سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی اور لاہور سے بھی بھائی لوگوں نے بلا اجازت شائع کر دی، لیکن ظلم یہ کیا کہ آخر میں دو صفحات پر مبنی نہایت اہم فہرست مآخذ کو اڑا دیا (ناشر کو ان دو صفحات کی مد میں غالباً لاکھوں کروڑوں کی بچت ہوئی ہوگی، رہ گئے حوالے سو: ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں)

☆۲۱۔اردو ضرب الامثال (۲۰۰۹ء)

ثروت سلطانہ ثروت کی مرتبہ یہ فرہنگ کراچی سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی[۲۵]۔یہ تقریباً سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں کہاوتوں کی مختصراً وضاحت کی گئی ہے۔مولفہ نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انھوں نے ''ضرب الامثال کو معیاری اور مستند تصانیف سے یک جا کیا اور طلبہ کی

استعداد بڑھانے کے لیے ان کو اس کتاب میں یک جا کر دیا''۔اس کے بعد انھوں نے خاص طور پر ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے اس لغت کو مرتب کرتے ہوئے استفادہ کیا ہے۔ان میں کُل تین (۳) کتابیں شامل ہیں جن میں سے دو فیروز اللغات کے مختلف ایڈیشن ہیں اور ایک فیروز سنز کی اردو انگریزی لغت ہے۔

اردو میں کہاوتوں کی لغات (جن میں سے کچھ کا ذکر صفحاتِ گزشتہ میں آیا ہے) کی دو سو سالہ تاریخ سے سراسر ناواقف ہوتے ہوئے ایک غیر معیاری لغت کو بنیاد بنا کر کہاوتوں کی لغت مرتب کرنا تو خیر سمجھ میں آتا ہے لیکن موصوفہ نے پیش لفظ میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ''یقیناً یہ کتاب اس اعتبار سے اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے''۔اس پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا کرے کہ یہ اپنی نوعیت کی آخری کتاب بھی ہو۔

حواشی:

۱۔اردو لغت (تاریخی اصول پر)، ج۱۷ (کراچی: اردو لغت بورڈ)، ۲۰۰۰ء۔

۲۔ایضاً۔

۳۔ The Oxford Encyclopedic Englsih Dictionary (اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)۔

۴۔یونس اگاسکر، اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو (دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۱-۳۰

۵۔وولف گینگ میڈر (Wolfgang Mieder)، Proverbs: A Handbook، (ویسٹ پورٹ: گرین وڈ پریس، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۔

۶۔ایضاً، ص ۳۔

۷۔گوہر نوشاہی، تعارف، خزینۃ الامثال (مصنفہ شاہ حسین حقیقت)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)۔

۸۔ایضاً۔

۹۔دیکھیے: خزینۃ الامثال کے ابتدائی صفحات (مطبوعہ مقتدرہ) مرقومہ عبدالرحمٰن شاکر جن کا عکس مقتدرہ کی اشاعت میں بھی شامل ہے۔

۱۰۔سجایا: یہ عربی لفظ ''سَجِیۃ'' یعنی ''عادت، مزاج، سیرت'' کی جمع ہے۔

۱۱۔ظفر الرحمٰن، ہماری کہاوتیں، مشمولہ ''رہنمائے اردو محاورات و اضرب الامثال'' (لاہور: ملک بک ڈپو)، ص ۴۵۴

۱۲۔ایضاً۔

۱۳۔مولوی محمد نجم الدین، نجم الامثال، (دہلی: مطبع احمدی، ۱۸۸۸ء) ص ۲۔ا[اشاعتِ ثالث]

۱۴۔ایضاً، ص ۳۔

۱۵۔ایضاً، ص ۴۔

۱۶۔ص ۳۲۰۔

۱۷۔اس کے ۱۸۸۶ء کے ایڈیشن کی لوح پر طباعت واشاعت سے متعلق یہ عبارت درج ہے:

PRINTED AT THE MEDICAL HALL PRESS, BANARAS

MAY BE HAD FOR CASH ONLY, OF

E.J.LAZARUS & CO., BANARAS---TRUBNER & CO. LONDON

۱۸۔اشاعتِ دوم پر "کارخانہ پیسہ اخبار، لاہور" اور "مطبع خادم التعلیم پنجاب" درج ہے۔اشاعتِ ثالث، پیسہ اخبار، لاہور، ۱۹۳۶ء۔

۱۹۔ملاحظہ ہو: کیفیہ، (لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء)، ص ۱۹۳۔

۲۰۔مطبوعہ پیسہ اخبار، لاہور، ۱۹۰۳ء، تیسری اشاعت۔

۲۱۔مطبع مجیدی، کان پور، ۱۹۲۴ء، بارِ اول۔

۲۲۔مطبع شمسی، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۲۱ھ۔

۲۳۔نشریات، لاہور، ۲۰۱۷ء۔

۲۴۔کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۵۸ء، بارِ سوم۔

۲۵۔دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۷۷ء۔

۲۶۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۹ء۔

مآخذ:

۱۔ادیب، مسعود حسن رضوی، فرہنگ امثال، لکھنؤ: کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۵۸ء، بارِ سوم۔

۲۔اصغر، راجیشور راو، گنجینۂ امثال، حیدرآباد (دکن)، مطبع شمسی، ۱۳۲۱ھ۔

۳۔اگاسکر، یونس، اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو، دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء۔

۴۔بخاری دہلوی، سید یوسف، مرقع اقوال وامثال، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۴ء، اشاعتِ اول۔

۴۔پریمی، سیفی، کہاوت اور کہانی، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۷۷ء، اشاعتِ اول۔

۵۔ثروت، ثروت سلطانہ، اردو ضرب الامثال، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۹ء۔
۶۔جعفری، جلال الدین احمد، خزینۃ الامثال، الٰہ آباد: مکتبہ انوار احمدی، سن ندارد۔
۷۔حقیقت، شاہ حسین، خزینۃ الامثال، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔
۸۔سرہندی، وارث، جامع الامثال، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔
۹۔ظفر الرحمٰن دہلوی، ہماری کہاوتیں، مشمولہ "رہنمائے اردو محاورات وضرب الامثال"، (مرتبہ عدنان عادل زیدی ومخدوم صابری) لاہور: ملک بک ڈپو، ۲۰۰۹ء۔
۱۰۔عالم، منشی محبوب، محبوب الامثال، لاہور: پیسہ اخبار، ۱۹۳۶ء، اشاعت ثالث۔
۱۱۔عبدالمجید دہلوی، خواجہ محمد، مقصہ طلب ضرب الامثال، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۳۸ء۔
۱۲۔فیلن، ایس ڈبلیو A Dictionary of Hindustani Proverbs (Fallon, S.W) (۱۸۸۴ء) بنارس، ۱۸۸۶ء، (اشاعت دوم)
۱۳۔قادری سہارن پوری، خواجہ محمد باقر حسن، قصص الامثال، دہلی: رائل ایجوکیشنل بک ڈپو، ۱۹۳۷ء [؟]
۱۴۔قریشی، شریف احمد، کہاوتیں اور ان کا حکایتی اور تلمیحی پس منظر، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۲۰۰۳ء۔
۱۵۔کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفیہ، لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء۔ [طبع دوم]
۱۶۔مذاق، احمد حسین خان، گلدستۂ امثال، لکھنؤ: نظامی پریس، سن ندارد۔
۱۷۔مقبول الٰہی، اردو میں مستعمل عربی وفارسی ضرب الامثال، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء۔
۱۸۔منیر لکھنوی، گنجینۂ اقوال وامثال، لاہور: نشریات، ۲۰۱۷ء۔ [اشاعت اول ۱۹۳۳ء]
۱۹۔منیر لکھنوی، ملک کی زبان المعروف بہ محاورات ہندوستان، کان پور: مطبع مجیدی، ۱۹۲۴ء، بار اول۔
۲۰۔میڈر، وولف گینگ (Mieder, Wolfgang)، Proverbs: A Handbook (ویسٹ پورٹ: گرین وڈ پریس، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۔
۲۱۔نجم الدین، نجم الدین، نجم الامثال، دہلی: مطبع احمدی، ۱۸۸۸ء [اشاعت ثالث]
۲۲۔نوشاہی، گوہر، تعارف، خزینۃ الامثال (مصنفہ شاہ حسین حقیقت)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔
۲۳۔(نامعلوم مولف)، ایشیا اور یورپ کی ضرب المثلیں، لاہور: پیسہ اخبار، ۱۹۰۳ء، اشاعت سوم۔

کتب حوالہ:

ا۔اردو لغت (تاریخی اصول پر)، ج ۱۷، کراچی: اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۰ء۔
۲۔ The Oxford Encyclopedic Englsih Dictionary اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء۔

مسائلِ تلفظ، فرہنگِ تلفظ اور صوتیات

چچا غالب کے بقول:

ع: یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب

لیکن مسائلِ تلفظ بھی مسائلِ تصوف سے کم نہیں ہیں اور تلفظ کے ضمن میں اردو میں بڑے اختلافات رہے ہیں۔ بعض الفاظ کے تلفظ پر خاصی دل چسپ بحثیں بھی ملتی ہیں۔ تلفظ سے متعلق مسائل بالعموم لغات کے ذریعے فیصل ہوتے ہیں۔ لیکن اردو میں تلفظ کو ظاہر کرنے والی خصوصی لغات نہ ہونے کے برابر ہیں (لغت کو اردو میں مذکر بھی بولا جاتا ہے اور مونث بھی۔ اب چونکہ لغت کے لیے صیغۂ تانیث زیادہ رائج ہو گیا ہے لہٰذا یہاں اسی کی پیروی کی گئی ہے)۔

تلفظ کی نشان دہی

اردو لغات میں تلفظ کو ظاہر کرنے کے بالعموم دو طریقے مستعمل ہیں: ملفوظی اور مکتوبی۔ بعض لغات میں کہیں کہیں تیسرا طریقہ بھی ملتا ہے جس میں مساوی الاعراب یا ہم وزن الفاظ کے ذریعے تلفظ بتایا جاتا ہے۔ ایک چوتھا طریقہ بھی تھا جسے اعراب بالحروف کہتے ہیں۔ ان طریقوں کی کچھ وضاحت پیش ہے:

ا۔ ملفوظی طریقہ:

تلفظ بتانے کے ملفوظی طریقے میں (جسے توضیحی طریقہ بھی کہتے ہیں) تلفظ اس طرح بتایا جاتا ہے کہ ہر لفظ کے اندراج کے بعد قوسین یعنی بریکٹ میں ہر حرف پر اعراب (زیر، زبر، پیش وغیرہ) کو الگ الگ واضح کیا جاتا ہے اور اس کے لیے عام طور پر اصطلاحات (مثلاً واوِ معروف یا یائے مجہول وغیرہ) استعمال کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اختصار کی غرض سے ان اصطلاحات کے مخففات بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر لفظ ''نظر'' کا تلفظ بتانا ہے تو ملفوظی طریقے میں لغت

میں لفظ ''نظر'' لکھنے کے بعد قوسین میں بتایا جائے گا کہ نون پر فتحہ یعنی زبر ہے اور ظوئے پر بھی فتحہ ہے۔ اسے ''ن، ظ مفتوح'' لکھا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لغت نویس ''فتحہ اول و دوم'' یا ''بفتحۂ اول و دوم'' لکھ دیں۔ کوئی لغت نویس بفتحتین (یعنی دونوں پر زبر) بھی لکھ سکتا ہے۔ لفظ نظر کے آخری حرف یعنی رے (ر) کا تلفظ نہیں بتایا جائے گا۔

آخری حرف کا تلفظ واضح نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں ہر لفظ کا آخری حرف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور اس پر جزم لگا کر اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی[1]۔

۲۔ مکتوبی طریقہ

مکتوبی طریقے میں لغت میں لفظ کے اندراج کے بعد اس کے حروف پر اعراب لگادیے جاتے ہیں، یعنی لفظ ''نظر'' لکھ کر اسی میں نون اور ظوئے پر زبر کی چھوٹی سی ترچھی لکیر لگادی جائے گی اور الگ سے وضاحت نہیں کی جائے گی۔ بعض لغات میں دونوں طریقے بیک وقت استعمال کیے جاتے ہیں اور بعض میں کسی ایک پر زیادہ زور ہوتا ہے اور دوسرا طریقہ کم کم استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ مساوی الاعراب الفاظ

تیسرا طریقہ جو بہت ناقص تھا اور اب بہت کم استعمال ہوتا ہے، ہم وزن الفاظ یا مساوی الاعراب (جنھیں مساوی الحرکات بھی کہا جاتا ہے) الفاظ کے ذریعے تلفظ بتانے کا تھا، مثلاً لفظ حُور (واوِ معروف سے) کا تلفظ یوں بتایا جائے گا: ''بروزنِ نُور''۔ سوال یہ ہے کہ جس بے چارے قاری کو دوسرے ہم وزن لفظ کا بھی درست تلفظ نہیں معلوم وہ کیا کرے؟ اس طریقے میں لغت نویس یہ گویا فرض کرلیا کرتا تھا کہ قاری دوسرے لفظ کے تلفظ سے واقف ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہر لفظ کے تلفظ کے بارے میں یہی فرض کرلیا جائے؟ بلکہ الفاظ کے معنی کے بارے میں بھی یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ قاری ان سے واقف ہوگا، چلیے چھٹی ہوئی۔ لیکن یہ مذاق کی بات نہیں ہے، فارسی کی بعض پرانی لغات میں لفظ کے بعد معنی کی بجائے لکھا ہے ''معروف است''، یعنی معروف ہے، گویا سب جانتے ہیں۔ تو پھر اس لفظ کو لغت میں لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن اب اس طریقے سے شاید ہی کسی لغت میں تلفظ بتایا جاتا ہو۔

۴۔ اعراب بالحروف

چوتھا طریقہ اعراب بالحروف کا تھا۔ اسے حرکات بالحروف بھی کہا جاتا تھا۔ اس طریقے میں ہوتا یہ تھا کہ کسی حرف پر ضمہ (یعنی پیش) ہوتا تو اس پر پیش لکھنے کی بجائے اس حرف کے بعد واو لکھ دیتے تھے اور اسی طرح کسرہ (یعنی زیر) لکھنے کی بجائے جس حرف پر زیر ہوتا اس کے بعد "ی" لکھ دیتے تھے۔ دراصل املا کا یہ رجحان ترکی زبان سے اردو میں آیا تھا اور اردو میں بھی قدیم دور میں کسی لفظ میں زیر کی بجائے "ی" اور پیش کی بجائے "و" لکھا جانے لگا تھا، مثلاً اُن کی بجائے اون، اُس کی بجائے اوس، اِدھر کی بجائے ایدھر اور کِدھر کی بجائے کیدھر لکھا جاتا تھا، اگرچہ ان کا تلفظ اُن، اُس، اِدھر اور اُدھر ہی کرتے تھے۔ اس کی تفصیل مختلف مآخذ میں موجود ہے اور یہاں صرف اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں، مثلاً دیوان زادہ کے دیباچے میں شاہ حاتم نے لکھا ہے کہ میں نے جو اصلاحات کی ہیں ان میں اودھر (بجائے اُدھر) اور کیدھر (بجائے کِدھر) کو ترک کر دیا ہے[۲]۔

حاتم کے بعد انشاء اللہ خاں انشاء نے دریائے لطافت میں جہاں اور اصلاحات تجویز کیں وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ایدھر اور اودھر میں "ی" اور "و" کا لکھنا درست نہیں ہے۔ انشاء اللہ خاں انشاء کے مطابق:

> "ایدھر، کیدھر، اودھر، پور کی "ی" اور "واؤ" جیسے شہزاد پور، شاہ جہاں پور [میں] کتابت میں ضمہ کی رعایت سے واو اور کسرہ کی رعایت سے "ی" لکھ دیتے ہیں اور بعضے نہیں لکھتے۔ صحیح وہ ہیں جو نہیں لکھتے کیونکہ اگر ترکی کے قاعدے کے مطابق حرفِ مضموم کے بعد "واؤ" اور حرفِ مکسور کے بعد "ی" لکھنا ضروری ہے تو حرفِ مفتوح کے بعد "الف" بھی لکھنا چاہیے اور ایسا نہیں ہوتا... ترکی زبان کے فصحا اس مزید حرف کا اعلان تلفظ میں نہیں کرتے ... "اِدھر" میں جو "یا" نہیں لکھتے اس کی وجہ یہی ہے کہ حرکت کے بعد حرف بڑھانا ضرور نہیں۔ اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ "اُس" اور ایسے تمام ہندی لفظوں میں جن میں ضمہ

بغیر واو کے آواز دیتا ہے، واو کا لکھنا صحیح نہیں۔ایسا ہی حال ''ی'' کا ہے۔
جس حرف کے بعد تلفظ میں اس کا اظہار ہو تو کتابت میں بھی درست ہے
ورنہ غلط۔''[۳]

شہزاد پور اور شاہ جہاں پور کی مثال سے خیال آتا ہے کہ اردو والے جہاں جہاں شہروں کے نام کے ساتھ ''پور'' بولتے ہیں اس کا صحیح تلفظ ''پُر'' ہے، مثلاً شکار پور اور خیر پور کا درست تلفظ بالترتیب ''شکار پُر'' اور ''خیر پُر'' ہوگا۔ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے البتہ اس ضمن میں یہ رعایت دی ہے کہ اگرچہ شکار پور اور کان پور کا ''فصیح تلفظ شکار پُر، کان پُر'' ہے لیکن ''لفظ کی اصل کا لحاظ کر کے اس کی کتابت کی جائے، یعنی شکار پور، کان پور، گو کہ اس کا تلفظ پُر کیا جائے۔''[۴]

غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے اردو املا کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اعراب بالحروف کے ضمن میں بعض قدیم متون میں ''اُس'' اور ''اُن'' کو واو کے ساتھ یعنی ''اوس'' اور ''اون'' لکھے جانے کی طرف اشارے کیے ہیں[۵]۔ تلفظ ظاہر کرنے کا یہ طریقہ اب ترک کر دیا گیا ہے اور اب صرف پرانے متون یا مخطوطات میں ملتا ہے۔ البتہ جہاں شعرا نے ان الفاظ کو ''و'' یا ''ی'' کے ساتھ اس طرح نظم کر دیا ہے کہ موزوں صورت میں صرف اس قدیم املے کے ساتھ ہی پڑھنا ممکن ہے (ورنہ مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا) وہاں مجبوراً ان کو ویسے ہی لکھنا پڑے گا جیسے قدیم متون میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ اِدھر کی بجائے ''ایدھر'' بعض شعرا کے ہاں ''فعلن'' کے وزن پر بھی ملتا ہے[۶] اور تدوین کرنے والے کی مجبوری ہوتی ہے کہ اسے ایسے مقامات پر یہ اشباعی املا (یعنی ''و'' اور ''ی'' کے ساتھ) جدید متن میں بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے۔

اردو لغات میں تلفظ کی نشان دہی

تلفظ ظاہر کرنے کے ان طریقوں کے بعد اب آتے ہیں اردو لغات میں تلفظ کی نشان دہی کی طرف۔ ابتدائی دور کی مستند ترین اردو لغت ''فرہنگِ آصفیہ'' میں تلفظ بالعموم مکتوبی طریقے سے ظاہر کیا گیا ہے یعنی لفظ کے اندراج کے بعد اس کے ہر حرف پر اعراب لگا دیے گئے ہیں اور اس ضمن میں مسعود ہاشمی کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ فرہنگِ آصفیہ میں تلفظ بتانے کا کوئی

با قاعدہ نظام نہیں ہے کیونکہ اس لغت میں بہرحال مکتوبی طریقے کی کچھ نہ کچھ پابندی کی گئی ہے۔ البتہ فرہنگِ آصفیہ میں کہیں کہیں مکتوبی طریقے سے انحراف بھی کیا گیا ہے اور بعض الفاظ کے ایک دو حروف پر کوئی اعراب ہے اور بقیہ پر کوئی نشان نہیں ہے، مثلاً فرہنگِ آصفیہ کی پہلی جلد میں لفظ ''بکواسَن'' کے ہر حرف پر اعراب ہے، حتیٰ کہ اس لفظ کے آخری حرف یعنی نون پر بھی جزم بنا ہوا ہے جس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن کہیں کسی لفظ کے اندراج کے بعد قوسین میں ''بواوِ مجہول'' لکھ دیا گیا ہے (جو ملفوظی طریقہ ہے)، جیسے لفظ ''اوپ'' اور لفظ ''اوت'' میں (اس لیے کہ اردو میں واوِ مجہول کی بالعموم کوئی علامت نہیں ہوتی لہٰذا یہ بہرحال لغت نولیس کی مجبوری تھی)۔ جبکہ لفظ ''اودھو'' میں الف پر پیش بنایا گیا ہے اور اندراج کے بعد قوسین میں لکھا ہے ''بواوِ ثانی مجہول''، گویا پہلا واو معروف ہے اور دوسرا مجہول۔

آصفیہ میں کہیں کسی لفظ پر کوئی اعراب ہی نہیں ہے، مثلاً چوتھی جلد میں لفظ ''ہوا'' میں پہلے حرف پر زبر نہیں بنا ہوا اور اس کے بعد ملفوظی طریقے سے بھی نہیں بتایا کہ پہلے حرف پر زیر ہے یا زبر یا پیش۔ یہاں مغالطے کا امکان ہے کیونکہ اردو میں ایک لفظ ''ہُوا'' (مضموم) بھی ہے۔ گو آصفیہ میں کئی الفاظ جن کے پہلے حرف پر زبر ہے ان میں زبر بنایا گیا ہے، مثلاً لفظ ''اژدہا'' میں، لیکن بعض الفاظ کے پہلے حرف پر زبر نہیں بھی لکھا گیا۔ اسی طرح آصفیہ نے لفظ ''ہوش'' میں قوسین میں وضاحت بھی نہیں کی اس میں واو مجہول ہے یا معروف یا لین ۸۔ حالانکہ اردو میں ایک لفظ ''ہُوش'' (بواو معروف) بھی ہے۔

گویا فرہنگِ آصفیہ میں لفظ کا تلفظ ظاہر کرنے کے لیے مکتوبی طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ملفوظی یا توضیحی طریقہ بھی استعمال ہوا ہے۔ آصفیہ میں تلفظ کی وضاحت کے ضمن میں استعمال کیے گئے اعراب وعلامات اور اشارات کی ایک فہرست بھی لغت کے شروع میں موجود ہے لیکن اس نظام کی زیادہ سختی سے پابندی نہیں کی گئی ہے۔ بہرحال، فرہنگ آصفیہ میں تلفظ بتانے کا نظام موجود ہے گو اس میں کہیں کہیں یکسانی یا تسلسل نہیں بھی ملتا۔ لہٰذا مسعود ہاشمی صاحب سے اس ضمن میں اتفاق مشکل ہے۔

نسبتہً بعد کے دور کی دوسری اہم لغت امیر اللغات میں بھی مکتوبی طریقہ استعمال ہوا ہے

اور ملفوظی طریقہ بالکل استعمال نہیں کیا گیا۔ اسی لیے امیر نے ابتدا میں ملفوظی اعراب کی وضاحت بھی نہیں دی۔ لیکن فرہنگ آصفیہ کے برعکس امیر اللغات میں بعض اوقات لفظ پر کوئی اعراب نہیں ملتے اور ملفوظی طریقے سے وضاحت بھی نہیں کی گئی ہے، مثلاً لفظ احتمال، احتیاج اور احتیاط میں صاحب فرہنگ آصفیہ نے الف اور تے پر کسرہ (زیر) لگانے کا اہتمام کیا ہے لیکن امیر اللغات میں ان الفاظ میں سے احتمال اور احتیاج کے الف پر کسرہ (زیر) ہے لیکن تے کے اعراب غائب ہیں، لفظ احتیاط کے اندراج میں یہ احتیاط بھی نہیں کی گئی کہ الف پر زیر لگا دیا جائے۹۔

نور اللغات بیسویں صدی میں لکھی گئی ایک اہم اردو لغت ہے اور بعد کے دور میں تالیف ہونے کی وجہ سے اس میں تلفظ کا بہتر نظام ہونے کی توقع ہونی چاہیے لیکن یہ اپنے پیش روؤں سے اس معاملے میں بہت پیچھے ہے۔ نور اللغات میں تلفظ بتانے کا کوئی یکساں اور باقاعدہ نظام نہیں ہے۔ کئی الفاظ نور اللغات میں ایسے درج ہیں جن کا کوئی تلفظ کسی طریقے سے نہیں دیا گیا ہے، مثلاً بھتیجا، بہلنا ر بہل جانا، بہلیا اور بہتیرا کے تلفظ کی کوئی وضاحت کسی طریقے سے نہیں کی گئی ہے۔ بعض الفاظ کا تلفظ توضیحی یا ملفوظی طریقے سے دیا ہے، مثلاً لفظ بھوٹیا، بھجنگا اور بھوڈل کا۔ اس کے برعکس بعض الفاظ کا تلفظ نور اللغات نے مکتوبی طریقے سے درج کیا ہے، مثلاً ازبک، ایلچنا اور بُرسی ربرسی۔ بعض الفاظ کا تلفظ نور اللغات میں دونوں طریقے سے ملتا ہے مثلاً ازل اور بھلی۔ جبکہ لفظ ''بھنگی'' کا اندراج اور تلفظ دونوں نور میں اس طرح دیے ہیں کہ انھیں عجیب ہی کہا جا سکتا ہے۔ اول تو اس کے عمومی طور پر رائج املے یعنی ''ب ھ ن گ ی'' کی بجائے اس کا املا ''ب ن ھ گ ی'' کیا گیا ہے (یعنی ''ب'' کے بعد ''ھ'' کی بجائے ''ن'' ہے) اور یہ کاتب کی غلطی بھی نہیں ہے کیونکہ ترتیبِ لغت کے لحاظ سے اسے ''بنولا'' کے بعد درج کیا گیا ہے۔ چلیے اسے اس لیے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ مہنگا (منہگا) اور مہندی (منہدی) کی طرح بھنگی ر بنھگی کے املا اور تلفظ میں نون غنے کی صحیح جگہ متنازع فیہ ہو سکتی ہے (رشید حسن خان ان الفاظ میں میم کے فوراً بعد نون غنہ لکھنے کے قائل ہیں، یعنی منہگی، منہگا اور منہدی کو درست قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو ان کی کتاب ''اردو املا'')۔ پھر اس کے املا میں بھی کاتب نے ہائے مخلوط

یعنی ہائے دوچشمی (ھ) لکھی ہے (اس غلطی کو کاتب ہی کے سر مڑھنا چاہیے)، پھر اس کا ملفوظی طریقے سے بھی تلفظ عجیب وغریب اور مختلف انداز میں لکھا گیا ہے۔ نور نے کہیں کہیں تیسرا طریقہ (یعنی ہم وزن الفاظ) بھی استعمال کیا ہے، مثال کے طور پر لفظ بوتیار کا تلفظ ''بروزنِ موسیقار'' لکھا ہے۔ لفظ ''اونا'' کا وزن اس طرح لکھا ہے: بروزنِ سونا، چونا۔ اب قاری بے چارہ سر مارتا رہے کہ یہاں واو معروف ہے یا مجہول (کیونکہ لفظ سونا واو معروف سے بھی ہے اور واو مجہول سے بھی اور یہی کیفیت لفظ چونا کی ہے)۔

تلفظ، صوتیات اور آئی پی اے

تلفظ کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ تلفظ کا مسئلہ تو دراصل لسانیات (linguistics) اور صوتیات (phonetics) سے جڑا ہوا ہے۔ بلکہ اب لغت نویسی کو لسانیات کی ایک شاخ ہی سمجھا جاتا ہے اور تلفظ کو ظاہر کرنے کے لیے صوتیات ہی سے مدد لینی چاہیے جیسا کہ انگریزی کی لغات میں اب کیا جانے لگا ہے۔ تلفظ کی نشان دہی کے لیے اب انگریزی لغات میں بین الاقوامی صوتیاتی حروف تہجی یعنی International Phonetic Alphabet استعمال ہوتے ہیں جنھیں مختصراً آئی پی اے (IPA) کہا جاتا ہے۔ اردو میں کی پہلی لغت جس میں تلفظ آئی پی اے کی مدد سے بتایا گیا ہے اوکسفرڈ کی ضخیم اردو بہ انگریزی لغت (اشاعت اول ۲۰۱۳ء) ہے۔ یہ اس ضمن میں واحد لغت بھی تھی۔ اب پیراماؤنٹ کی مختصر اردو بہ انگریزی لغت (اشاعت اول ۲۰۱۸ء) میں اس کی تقلید کی گئی ہے۔

آوازوں کو ظاہر کرنے کا نظام اور معیاری تلفظ

تلفظ کے ضمن میں ایک خاص اہمیت کسی زبان میں موجود آوازوں کے تعین اور ان آوازوں کے ادا کرنے کے طریقوں کی ہے۔ جب تک ان آوازوں کو ظاہر کرنے کا باقاعدہ نظام وضع نہ کیا جائے لغت میں (یا کہیں اور بھی) تحریری شکل میں ان آوازوں کو لکھنا اختلافی مسئلہ رہے گا۔ دوسرا اختلاف معیاری یا متفقہ تلفظ پر ہوتا ہے۔ بلکہ معیاری تلفظ کو طے کرنا بڑا مسئلہ ہوتا ہے، خاص طور پر اردو میں۔ لیکن تلفظ کو ظاہر کرنے اور معیاری تلفظ کو طے کرنے کے ضمن میں انگریزی میں بہت کام ہوا ہے۔ انگریزی میں تلفظ کو ظاہر کرنے والی خصوصی لغات

موجود ہیں۔ تلفظ بتانے کے ضمن میں انگریزی میں ایک بہت معروف اور قابلِ ذکر کام ''انگلش پرونانونسنگ ڈکشنری'' (Englsih Pronouncing Dictionary) کے نام سے ہے۔ تلفظ بتانے والی یہ انگریزی لغت معروف ماہر لسانیات ڈینیل جونز (Daniel Jones) (۱۸۸۱ء۔۱۹۶۷ء) نے مرتب کی تھی اور یہ پہلی بار ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی جس کے بعد اس کے کئی جدید ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں[۱۱]۔ ڈینیل جونز یونیورسٹی کالج لندن میں صوتیات (phonetics) کا پروفیسر تھا اور صوتیات پر اس کا کام تاریخی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ڈینیل جونز وہ ماہر لسانیات تھا جس نے سب سے پہلے انگریزی میں فونیم (phoneme) (یعنی صوتیہ) کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا جن معنوں میں یہ اب رائج ہے[۱۲]یعنی: ''آواز کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی؛ کسی زبان میں پائی جانے والی وہ منفرد اور متمیز آواز جس کی مدد سے ایک لفظ کو دوسرے سے الگ شناخت کیا جاتا ہے''۔ یہ تعریف مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں دی گئی ہے لیکن مفہوم یہی ہے جو یہاں ہم نے اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے۔

انگریزی میں فونیمیات (phonology) اور صوتیات (phonetics) پر ڈینیل جونز کی قابلِ قدر تحریروں کے علاوہ اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے انگریزی کے بنیادی یا اساسی مصوتوں (cardinal vowels) کا تصور پیش کیا۔ اس کام کے لیے اس نے ایک چار ضلعی محرف شکل وضع کی جسے انگریزی میں ٹریپ زیئم (trapezium) کہتے ہیں۔ یہ شکل پوری دنیا میں بار بار بنائی اور نقل کی جاتی ہے اور اس کی مدد سے مصوتوں (vowels) کا تلفظ ادا کرتے وقت انسانی ہونٹوں اور زبان (بمعنی جیبھ یا tongue) کی حالتوں (بلندی، پستی اور حرکت) کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ کسی آواز کا تلفظ ادا کرنے کے عمل کو لسانیات کی زبان میں تلفیظ (articulation) کہتے ہیں[۱۳]۔ گویا مصوتوں کی تلفیظ کو کسی محرف ہندسی (یعنی جیومیٹریکل) شکل کے ذریعے ظاہر کرنے کا کام سب سے پہلے ڈینیل جونز نے کیا۔
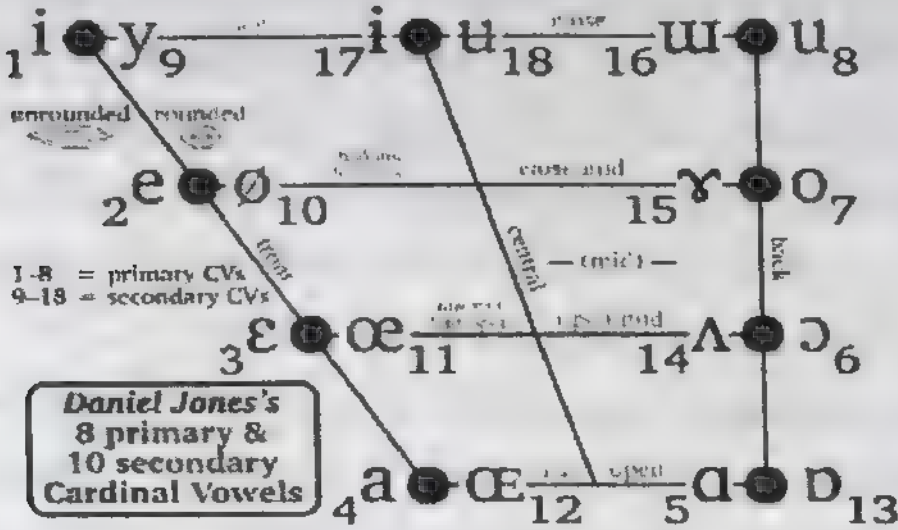
ڈینیل جونز کی تحقیق پر مبنی چار ضلعی منحرف ہندسی شکل جو "ٹریپ زیئم" (trapezium) کہلاتی ہے۔
اس میں بنیادی مصوتوں کی ادائی کے وقت انسانی زبان کی حرکت اور بلندی و پستی دکھائی گئی ہے۔

علمِ اصوات، صوتیات اور تلفیظ پر کام کرنے اور انگریزی کی تلفظ بتانے والی لغت کی ترتیب کے علاوہ ڈینیل جونز نے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ اس نے انگریزی کے "مثالی تلفظ" کی تعریف کو طے کیا، اگرچہ اس نے خود ہی وہ تعریف وقت کے ساتھ بدل دی جو اس نے "مثالی انگریزی تلفظ" کے لیے پیش کی تھی۔ اس نے ابتدا میں یہ کہا کہ انگریزی کا مستند اور معیاری تلفظ وہ ہے جو پڑھے لکھے برطانویوں کی انگریزی کا تلفظ ہے۔ اسے اس نے "پبلک اسکول پرونن سی ایشن" (Public School Pronunciation) کا نام دیا اور اس کا مخفف پی ایس پی (PSP) ٹھہرایا۔ بعد میں (اپنی لغت کے ۱۹۳۷ء کے اور بعد کے ایڈیشنوں میں) اس نے انگریزی کے معیاری تلفظ کا نام "رسیوڈ پرونن سی ایشن" (Received Pronunciation) رکھا اور اس کا مخفف آر پی (RP) قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خیال تھا کہ برطانوی اسکولوں کے طالب علم اپنی زبان اور تلفظ کی مقامی خصوصیات کھو چکے ہیں اور اب ان کی زبان اس تلفظ کا نمونہ ہے جو عام طور پر اور روزمرہ زندگی میں سنا جاتا ہے۔ اس کے بعد

اس نے لندن اوراس کے گردونواح کی انگریزی کے تلفظ کو معیاری انگریزی تلفظ قرار دیا[۱۴]۔ لیکن اس کی لغت کے چودھویں ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۷۷ء) کے مدیر الفریڈ چارلس گمسن (Alfred Charles Gimson) نے دیباچے میں لکھا کہ آج کے دور میں ''رسیوڈ پرونن سی ایشن'' (یا آر پی) کے نظریے کا دفاع نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ اصطلاح اتنے بڑے پیمانے پر رائج ہو چکی ہے کہ اسے لغت میں برقرار رکھنا پڑا۔[۱۵]

لیکن اب مغرب میں ''آر پی'' کی اصطلاح متروک ہو چکی ہے۔ پندرھویں ایڈیشن سے اس لغت کو کیمبرج یونی ورسٹی شائع کرتی ہے اور اس کے سترھویں ایڈیشن کے مدیران نے دیباچے میں لکھا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آر پی کی متروک اصطلاح کو چھوڑ دیا جائے اور برطانوی انگریزی کے مستند تلفظ کے لیے ''بی بی سی انگلش'' کی اصطلاح استعمال کی جائے جو بی بی سی کے ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بولی جانے والی انگریزی کا تلفظ ہے[۱۶]۔ ہائے ہائے! ان کا ٹی وی تو تلفظ کا محافظ اور اس کی مثال ٹھہرا اور ہمارے ٹی وی والوں نے اردو کا جنازہ نکال دیا۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

اردو کا معیاری تلفظ اور لغت

انگریزی میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ برطانوی انگریزی کے مقابلے میں امریکی انگریزی کا لہجہ اور تلفظ اور بعض صورتوں میں ہجے (بلکہ کبھی کبھی لفظ بھی) سرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر اردو کے تلفظ اور معیاری تلفظ کی بات کی جائے تو مسئلہ زیادہ گھمبیر نظر آتا ہے کیونکہ اول تو اردو برعظیم پاک و ہند کے وسیع و عریض خطوں میں اپنی مختلف علاقائی شکلوں، محاوروں اور لہجوں کے ساتھ بولی جاتی ہے اور اردو کے ایک ہی لفظ کا تلفظ مختلف خطوں، مثلاً جنوبی ہند (دکن اور میسور وغیرہ)، وسطی ہند، شمالی ہند، مشرقی ہند (بہار اور پورب وغیرہ)، گجرات اور پنجاب وغیرہ میں مختلف انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ ثانیاً، عربی، ترکی اور فارسی کے سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں گھل مل گئے ہیں اور ان کا تلفظ (اور بعض صورتوں میں مفہوم بھی) اصل زبان سے بہت مختلف ہو چلا ہے۔ لہٰذا اردو الفاظ کے درست اور معیاری تلفظ کے ضمن میں چار باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ اول یہ کہ عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی وغیرہ کے اردو میں دخیل الفاظ کی خاصی بڑی

تعداد ایسی ہے جن کے اصل زبان کے تلفظ کی بجاے اردو میں رائج تلفظ کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ اردو ایک الگ اور خود مختار زبان ہے اور اس کی اپنی قواعد ہے۔ لہٰذا ہر لفظ کے استعمال کے ضمن میں عربی فارسی وغیرہ کا تتبع مناسب نہیں۔ ہاں البتہ جب عربی یا ترکی یا فارسی بولیں گے تو ان الفاظ کا تلفظ اُن زبانوں کے لحاظ سے ادا کیا جائے گا۔ لیکن اردو میں اردو ہی کے تلفظ کو معیاری اور مستند تلفظ ماننا پڑے گا خواہ وہ عربی اور فارسی کے لحاظ سے کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ تلفظ کے علاوہ بسا اوقات مفہوم یا قواعدی اصولوں کے ضمن میں بھی اردو کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے ایک بار ''معارف'' میں لفظ ''اثرات'' لکھ دیا تو ایک نستعلیق اہلِ قلم نے انھیں خط لکھا کہ اثر کی جمع عربی میں اثرات نہیں بلکہ آثار ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ لفظ میں نے عربی میں نہیں بلکہ اردو میں لکھا ہے ۱۷۔ سلیمان ندوی صاحب سے بڑا عربی داں کون ہوگا لیکن ان کا ہاتھ اردو کی نبض پر بھی تھا اور وہ زبان کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ وہ اردو داں بھی تھے، زبان داں بھی اور اہلِ زباں بھی۔

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے کہ جب خواجہ حیدر علی آتش نے یہ شعر پڑھا کہ:

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہاں گیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ بیگم ترکی زبان کا لفظ ہے اور ترکی کے اہلِ زباں اس لفظ میں گاف پر پیش بولتے ہیں (گویا بیگَم کی بجاے بیگُم ہونا چاہیے اور اس میں ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہمدَم اور بیگُم ہم قافیہ نہیں ہیں)۔ آزاد کے مطابق آتش نے جواب دیا کہ ''ہم ترکی نہیں بولتے۔ ترکی بولیں گے تو بیگُم کہیں گے'' ۱۸۔ اسی طرح آتش نے جب مصرع کہا:

ع: اس خوان کی نمش کفِ مارِ سیاہ ہے

تو لوگوں نے کہا کہ یہ فارسی لفظ ہے اور اصل میں نمشک ہے۔ آتش نے جواب دیا کہ ''فارس جائیں گے تو ہم بھی نمشک کہیں گے۔ یہاں سب نمش کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہیے'' ۱۹۔ اگرچہ آتش پر کیے گئے بعض دیگر اعتراضات پر آزاد بھی معترضین کے ساتھ ہیں مگر

مذکورہ بالا دو مثالوں میں آزاد نے کم از کم سکوت اختیار کیا ہے۔ گویا آزاد یہاں بظاہر آتش سے متفق ہیں۔ ان بزرگوں کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عربی یا ترکی یا فارسی سے ناواقف تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ اردو زبان کا مزاج اور اس کے بدیسی الفاظ کے مقامی استعمال کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔

اب اسی لفظ آتش کو لیجیے، فارسی کی بعض مستند لغات کے مطابق اس کا صحیح تلفظ ''تے'' پر زبر کے ساتھ یعنی ''آتَش'' ہے اور فرہنگِ آصفیہ نے جرأت کا ایک شعر آتَش کی سند میں دیا ہے، جس میں آتَش کا قافیہ غَش ہے۔ لیکن اردو میں بالعموم ''تے'' کے نیچے زیر کے ساتھ یعنی ''آتِش'' بولا جاتا ہے۔ اسی طرح انگریزی کے بعض الفاظ جو اَب ہماری زبان کا حصہ ہیں ان کا تلفظ اردو میں عام آدمی کے لیے کسی طور انگریزی کے انداز میں ادا کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً لالٹین جس کی اصل انگریزی لفظ لینٹرن (lantern) ہے اس کا تلفظ اردو میں لالٹین ہی ہوگا۔ خواہ انگریزی میں کچھ ہی ہو۔ اسی طرح فرانسیسی کے جو الفاظ انگریزی میں دخیل ہیں ان کو بولتے ہوئے ایک انگریز ان کا تلفظ فرانسیسیوں سے بالکل الگ کرتا ہے خواہ دونوں زبانوں میں اس لفظ کے ہجے (spelling) ایک ہی ہوں، کیونکہ فرانسیسی کے اپنے تلفظ اور ہجے کے اصول ہیں جو انگریزی سے بہت مختلف ہیں اور بسا اوقات ایک ہی ہجے کے حامل لفظ کا انگریزی اور فرانسیسی تلفظ بہت مختلف ہوتا ہے۔ اپنے الگ اور مختلف تلفظ کا یہ اصول ان عربی فارسی الفاظ پر بھی منطبق ہوتا ہے جو اردو میں دخیل ہیں۔ لیکن ہمارے بعض دوست عربی یا فارسی کی لغت کھول کر ان الفاظ کا تلفظ معلوم کرتے ہیں اور پھر ہاتھ میں مولا بخش لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ سارے اردو والے فلاں لفظ غلط لکھتے ہیں (اور ماشاء اللہ ان ''غلط نویسوں'' میں شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور سید سلیمان ندوی کو بھی بے سمجھے شامل کر لیا جاتا ہے)۔ جو لوگ اردو زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہیں انھیں اردو پر فتوے دینے سے باز رہنا چاہیے۔

تلفظ اور اردو میں تلفظ کے موضوع پر رشید حسن خان نے اپنی کتاب ''زبان اور قواعد'' میں بہت عمدہ بحث کی ہے اور قابل قدر مثالوں کے ساتھ حوالے بھی دیے ہیں[۲۰]۔ یہاں ان مثالوں کو دہرایا نہیں جا رہا۔ مختصراً یہ کہ وہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ عربی اور فارسی کے جو الفاظ تغیر اور

تصرف کے بعد ہم تک پہنچے ہیں اور جن کو اساتذہ نے بھی درست مانا ہے وہ اسی تبدیلی کے ساتھ اردو کا حصہ ہیں، خواہ اصل زبان میں ان کا تلفظ یا مفہوم کچھ ہی ہو۔

ہاں البتہ ہر شخص کی زبان سے ادا ہونے والے تلفظ کے تمام تغیرات کو درست اور مستند مان لینا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ اسی طرح کی بات شان الحق حقی نے بھی لکھی ہے۔ وہ بھی تصرفات کو روا رکھتے ہیں لیکن زبان کا معیار طے کرنے پر بھی زور دیتے ہیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرح کے تلفظ کو درست مانا جائے یعنی جو عربی میں یا فارسی میں ہے وہ بھی اور جو اردو میں رائج ہو گیا ہے وہ بھی۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن صرف ایک مثال پیش ہے: موسم عربی کا لفظ ہے اور اس کا درست تلفظ عربی میں سین پر زیر کے ساتھ یعنی موسِم ہے۔ لیکن اب اردو میں اس کا عام تلفظ سین پر زبر کے ساتھ یعنی موسَم ہو چکا ہے۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دونوں طرح کے تلفظ کو درست تسلیم کیا جائے۔ اردو لغت بورڈ کی لغت میں بھی لفظ موسم کے دونوں تلفظ دیے گئے ہیں [۲]۔ اگرچہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اردو میں اردو ہی کے تلفظ کو ترجیح حاصل ہے اور صرف اردو کا تلفظ ہی درست مان جائے۔ اس کے برعکس بعض حضرات جو اردو زبان کے مزاج اور لسانیاتی اصولوں سے واقف نہیں ہیں اس بات پر بضد رہتے ہیں کہ جو تلفظ عربی یا فارسی کا ہے اردو میں بھی اسے بعینہٖ ویسا ہی رہنا چاہیے، بلکہ اردو میں صرف عربی ہی کا تلفظ درست ہے۔ حالانکہ یہ ہر لفظ کے ساتھ ممکن نہیں ہے کیونکہ اردو خالصتاً مقامی زبان ہے اور اپنی اصل میں آریائی ہے، جبکہ عربی سامی خاندان کی زبان ہے۔ ان دونوں زبانوں کے مزاج اور صرف ونحو میں بہت زیادہ فرق ہے اور عربی کے اصولوں کا اطلاق اردو پر نہ تو ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فارسی البتہ آریائی زبان ہے اور اردو کے مزاج سے قریب ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو میں فارسی کے الفاظ، محاورے، کہاوتیں اور مصرعے عربی کے ادبی ولسانی اجزا سے کہیں زیادہ جذب ہوئے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں ان عربی الفاظ پر بحث بھی کی ہے اور ان کی ایک فہرست بھی دی ہے جن کے معنی، املا اور تلفظ عربی میں کچھ ہیں اور اردو میں آ کر کچھ کے کچھ ہو گئے اور اب انھیں بدلنے کی کوشش کرنا تاریخ کے پہیے کو الٹا گھمانے کی نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں،

کیونکہ زبان کوئی جامد شے نہیں ہے اور یہ بدلتی رہتی ہے۔ جو لوگ عربی اور فارسی الفاظ کے اردو تصرفات پر اعتراض کرتے ہیں وہ نہ اردو زبان کے مزاج سے واقف ہیں اور نہ لسانی تبدیلیوں پر ان کی نظر ہے۔ سیدھی سی بات جو انشاء اللہ خاں انشاء نے کہی اور بابائے اردو نے بھی جس کی تائید کی اور جو بہت مشہور بھی ہے یہ ہے کہ جو لفظ اردو میں آگیا وہ اردو کا ہو گیا اور اب اس کا تلفظ، املا، مفہوم اور محاورے و مرکبات سب اردو کے لحاظ سے بنیں گے۔ اگر ہمیں یہ سب عربی اور فارسی کے حساب سے کرنا ہے تو پھر اردو کی ضرورت ہی کیا ہے، کیوں نہ عربی اور فارسی ہی بولی جائے؟ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور یورپ کی زبانوں کے ہزاروں الفاظ اپنی اپنی صورت بدل کر ہماری زبان میں ایسے رل مل گئے ہیں کہ ان کو پہچان کر اگر ہم ان کی اصلی شکلوں میں لکھنے اور بولنے لگیں تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی اور ایسے بدیسیوں کی بھیڑ ہر جگہ دِکھائی دے گی جو ہمارے دیس کے قانون کو نہیں مانتی۔ اس لیے ان بدیسیوں کو اس دیس میں رہنے سہنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ہمارے دیسی قانون کو قبول کر کے دیسی بن جائیں''۲۲۔

عربی ہمیں بہت عزیز ہے اور سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی بہت عزیز تھی، وہ عالمِ زباں بھی تھے اور عالمِ دیں بھی، وہ اردوداں بھی تھے اور اردو کے مزاج داں بھی۔ سید صاحب نے جو اہم بات یہاں کہی ہے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا مزاج اور فطرت، اس کی صرف و نحو عربی سے بہت مختلف ہے اور اردو والوں نے خلّاقی سے کام لے کر اردو کا جو تلفظ اور استعمال طے کیا ہے اردو میں اسی کو ترجیح حاصل ہے۔ ہاں جب عربی لکھیں گے تو ضرور عربی کے قواعد کی پابندی کریں گے۔ اردو میں کیے گئے تصرفات کو بیک جنبشِ قلم مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ اس مسئلے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ بعض عربی الفاظ ایسے ہیں کہ زیر اور زبر کی تبدیلی سے معنی میں فاعل اور مفعول کا فرق پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً منتظَر اور منتظِر (یعنی ظو ے پر زبر اور ظو ے پر

زیر)، مصوِر اور مصوَّر (واو پر زیر اور واو پر زبر)۔ ایسے الفاظ کے تلفظ میں عربی قواعد کی سختی سے پابندی کرنی ہوگی کیونکہ اس سے مفہوم بالکل تبدیل ہوسکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اقبالؔ کے مصرعے

ع: کبھی اے حقیقتِ منتظَر نظر آ لباسِ مجاز میں

میں منتظَر کو منتظِر پڑھتے ہیں اور میرؔ کے مصرعے

ع: دلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصوَّر تھے

میں مصوَّر کو مصوِر پڑھتے ہیں۔ کاش انھیں احساس ہو کہ اس طرح مفہوم خبط ہو کر رہ جاتا ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ جن الفاظ کے تلفظ میں اختلاف ہے لغت میں ان کے اندراج کے ساتھ اختلاف کی بھی وضاحت کر دینی چاہیے۔ لیکن عام اردو لغات میں بالعموم اس کا اہتمام نہیں ہوتا اور مختلف لغت نویس اپنے علاقے یا خطے کے تلفظ کو ترجیح دیتے ہیں یا عربی و فارسی الفاظ میں اصل زبان کے تلفظ ہی کو درست گردانتے ہیں، مثلاً امیر اللغات، نور اللغات اور مہذب اللغات کے مولفین لکھنؤ کے تلفظ کو ترجیح دیتے ہیں اور فرہنگِ آصفیہ چونکہ دہلی میں لکھی گئی لہٰذا اس میں دہلی کی طرف واضح جھکاو ہے۔ مہذب اللغات (مرتبہ مہذب لکھنوی) نے تو اختلافی معاملات میں جا بجا ''قولِ فیصل'' کی سرخی کے تحت الفاظ کے مخصوص مفہوم اور لکھنوی تلفظ کو حرفِ آخر قرار دے کر گویا یک رخے پن کی انتہا ہی کر دی ہے۔ لیکن آج اردو ایک طرح سے لامرکزیت کا شکار ہے، اب صرف دہلی اور لکھنؤ کی اردو کو سند نہیں مانا جاسکتا بلکہ اب دوسرے شہر بھی ٹکسال ہیں۔ اور اگر اردو کا کوئی مرکز اور مستند معیار ہے تو وہ اب لاہور بھی ہے، ملتان بھی ہے اور کراچی بھی اور دیگر کئی خطے بھی۔ گویا ایک معاصر اردو لغت میں تلفظ اور اس کے معیار نیز تلفظ کی وضاحت کے طریقے (خواہ ملفوظی یا مکتوبی ہو، خواہ آئی پی اے پر مبنی) کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ اختلافی تلفظ کی نشان دہی بھی ضروری ہے۔

فرہنگِ تلفظ

اردو الفاظ کے تلفظ اور تلفظ کی صحت کا ذکر ہو تو لامحالہ ایک ایسی اردو لغت کا ذکر آئے گا جو خاص طور پر تلفظ بتانے کے لیے مرتب کی گئی۔ اردو میں یوں تو عام لغات میں تلفظ بتانے کی

کوشش کی جاتی ہے اور برا بھلا تلفظ معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی یک جلدی لغت اردو میں موجود نہیں تھی جو صرف تلفظ بتانے کی غرض سے مرتب کی گئی ہو اور جس میں تلفظ کی وضاحت کے لیے ملفوظی اور مکتوبی طریقے دیے گئے ہوں۔ اردو لغت بورڈ کی لغت میں یہ اہتمام موجود ہے کہ اس میں مکتوبی اور ملفوظی دونوں طریقوں سے ہر لفظ کا تلفظ بالالتزام بتایا گیا ہے۔ لیکن وہ بائیس (۲۲) جلدوں پر مبنی ہے اور اس کی کئی خوبیوں کے باوجود عام قاری کے لیے اس سے استفادہ بوجوہ ممکن نہیں ہے۔

شان الحق حقی صاحب کی مرتبہ ''فرہنگِ تلفظ'' مقتدرہ قومی زبان (اب ادارۂ فروغِ قومی زبان) (اسلام آباد) نے پہلی بار ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ اس طرح اردو میں ایک بڑی کمی دور ہوگئی اور یہ اردو کی پہلی یک جلدی باقاعدہ تلفظ بتانے والی فرہنگ ٹھہری۔

فرہنگ تلفظ مرتبہ شان الحق حقی کے پہلے ایڈیشن میں مقتدرہ قومی زبان کے اس وقت کے صدر نشین افتخار عارف نے اس فرہنگ کی نوعیت، ماہیت اور دائرۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس لغت میں نہ صرف یہ کہ الفاظ کے تلفظ کی نشان دہی کی گئی ہے بلکہ اختلافی تلفظ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قواعدی علامات اور معانی کا اہتمام بھی موجود ہے جس سے یہ لغت علمی مقاصد اور عمومی لسانی ضروریات کے لیے یکساں طور پر کارآمد ہوگیا ہے۔ اس لغت میں بنیادی توجہ الفاظ کے اندراج پر دی گئی ہے۔ محاورہ اور روزمرہ شامل کر کے اسے بلاوجہ طولانی کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ اردو اصطلاحیں شامل ہیں لیکن اگر یہ اصطلاحیں انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں تو ان کے سامنے انگریزی مترادف بھی درج کر دیے گئے ہیں''[۲۳]۔

پہلے ایڈیشن میں حقی صاحب نے ''عرض مرتب'' کے زیر عنوان تلفظ، تصرف اور معیار کے ضمن میں اہم باتیں کی ہیں (جو بعد کے ایڈیشنوں میں بھی شامل ہیں)۔ اردو میں دیگر زبانوں کے الفاظ میں کیے گئے تصرفات کے باب میں لکھتے ہیں:

''یہ تصرفات اب سے پچھلے دوروں میں ہمارے پیش روؤں نے زیادہ دل کھول کر روا رکھے تھے۔ یہ آزادہ روی خود اعتمادی کی دلیل تھی یعنی بولنے والوں کو اپنی زبان کے مزاج اور وقار کا پاس تھا۔ وہ خود کو دوسری زبانوں کی روش کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ ... مستعار لفظ جب تک مقامی لب و لہجے کے لیے اجنبی رہے گا اور اپنی اصلیت پر اصرار کرے گا اوپری شمار ہوگا، پوری طرح جزوِ زبان نہ بن سکے گا۔ لیکن یہ تصرفات بعض صورتوں میں بے جا اور غیر ضروری بھی تھے جس کا سبب عمومی ناواقفیت تھی۔''[۲۴]

مختصراً یہ کہ اس پیش لفظ میں حقی صاحب تصرفات کو مانتے ہیں اور زبان میں تغیر کو فطری کہتے ہیں لیکن ہر تغیر درست نہیں سمجھتے اور ''ناخواندہ یا نیم خواندہ عوام الناس'' کے ہاتھوں ہونے والا ہر تغیر درست نہیں قرار دیتے۔ وہ معیار کے تعین پر بھی زور دیتے ہیں اور الفاظ کو صحت کے ساتھ برتنے کو ادبی، سماجی، قانونی، علمی و سائنسی ضروریات کے لیے لازم قرار دیتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے حقی صاحب نے فرہنگ تلفظ میں مکتوبی اور ملفوظی دونوں طریقے اپنائے اور کچھ علامات بھی وضع کیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ حقی صاحب نے اردو کی آوازوں کا لسانیات اور صوتیات کے تحت گہرا مطالعہ کیا اور درست تلفظ کی ادائی کے لیے نہ صرف کچھ نئی آوازوں کا تعین کیا بلکہ ان کے تلفظ کو تحریری شکل میں اور لغت میں واضح کرنے کے لیے کچھ علامات بھی بنائیں۔ وہ کہتے تھے (اور اردو لغت بورڈ کی لغت کے لیے اصول وضع کرتے ہوئے بھی حقی صاحب نے ان باتوں کا خیال رکھا تھا) کہ اردو میں کچھ آوازیں ایسی بھی ہیں جو مروجہ آوازوں سے الگ ہیں۔ مثلاً ان کے خیال میں اردو میں فتحہ (زبر)، کسرہ (زیر) اور ضمہ (پیش) کے علاوہ بھی کچھ خفیف اعراب ہیں جن کو وہ مجہول کہتے تھے۔ مثال کے طور پر لفظ شہر اور صحرا میں پہلے حرف پر جو زبر (فتحہ) ہے وہ عام زبر سے مختلف ہے جو ان الفاظ کے عام رائج تلفظ سے بھی ظاہر ہے۔ اسے وہ فتحۂ مجہول کہتے تھے۔ لفظ سہرا میں جو زیر ہے وہ ہلکا سا زیر ہے اور اسے وہ کسرۂ مجہول کہتے تھے۔ اسی طرح لفظ شہرت میں جو پیش ہے وہ اس پیش سے مختلف ہے

جو دوسرے لفظوں مثلاً تُم میں ہے۔ اسے وہ ضمۂ مجہول کہتے تھے۔ لغت بورڈ کی لغت میں بھی یہ اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں لیکن کم کم۔ فرہنگ تلفظ میں حقی صاحب نے بطور خاص ان اعراب کی وضاحت کی ہے اور ان کا استعمال تلفظ بتاتے ہوئے مدنظر رکھا ہے۔

تلفظ کے ضمن میں دوسرا مسئلہ ''غنہ'' کا ہے۔ اور یہاں بھی حقی صاحب کی لسانیات اور صوتیات کی مہارت کام کرتی نظر آتی ہے۔ دراصل صوتیات کے اصولوں کے مطابق نون غنہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک کی آواز ہلکی ہوتی ہے اور دوسرے کی واضح۔ نون کی ہلکی آواز والا نون غنہ وہ ہوتا ہے جو دراصل کسی الگ آواز کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اصل میں وہ مصوتوں (vowels) کے انفیائے جانے (nasalisation) کی علامت ہوتا ہے۔ مثلاً لفظ ماں کے املا کے آخر میں ہم جو نون غنہ لکھتے ہیں وہ صحیح معنوں میں اس جگہ یعنی الف کے بعد نہیں بولا جاتا (اور درحقیقت املا میں یہ اس کی درست جگہ نہیں ہے، اگرچہ رواج کی وجہ سے اس لفظ کو اب ایسے ہی لکھنا چاہیے)۔ بلکہ جب ہم لفظ ماں بولتے ہیں تو اس میں میم کے بعد والا الف ہماری ناک سے نکلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ یہ نون غنہ اصل میں الف کے اوپر لکھنا چاہیے کیونکہ الف جو ایک مصوتہ (یعنی vowel) ہے اس کی آواز ناک سے الف کے ساتھ ہی مل کر نکل رہی ہے اور ہم اسے یوں نہیں بولتے کہ پہلے ''ما'' بولیں اور پھر ''ں'' بولیں۔ یہاں غنے کی الگ سے کوئی آواز نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کو الگ سے آواز یا صوتیہ یا فونیم (phoneme) ماننے کی بجائے ناک سے نکلنے والا صوتیہ کہا جاتا ہے۔ اسی کو صوتیات کی زبان میں ''مصوتوں کا انفیانا'' (nasalisation of vowels) کہتے ہیں۔ گویا صوتیات میں اس طرح کا نون غنہ کوئی الگ سے باقاعدہ یا اساسی آواز نہیں ہوتی۔ اسی لیے جب آئی پی اے (IPA) میں ایسے الفاظ کا تلفظ بتایا جاتا ہے جن میں نون غنہ ہو تو مصوتوں کے اوپر ایک چھوٹی سی علامت (جس کی شکل ہمارے الف ممدودہ کے ''مد'' سے ملتی ہے) بنادی جاتی ہے اور اس کے لیے کوئی الگ سے حرف یا علامت نہیں لکھی جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں پاؤں، گاؤں اور چھاؤں جیسے الفاظ کے املا میں اختلاف رہا ہے اور کچھ لوگ بجا طور پر ان کو پانو (یعنی پاں و)، گانو (یعنی گاں و) اور چھانو (یعنی چھاں و)

لکھنے کی حمایت کرتے ہیں، یعنی یہاں نون غنہ درمیان میں آئے گا نہ کہ آخر میں اور اس نون غنے کو ظاہر کرنے کے لیے نون کے اوپر الٹا جزم بنایا جائے گا۔ نیز اس میں واو کے اوپر ہمزہ بھی نہیں چاہیے (یعنی مثلاً پاؤں نہیں لکھنا چاہیے) بلکہ درحقیقت اس کا یہی املا درست ہے جس میں ''ا'' (الف) کے بعد نون غنہ آتا ہے (یعنی پانو لکھنا چاہیے) کیونکہ ''پاؤں'' وغیرہ (یعنی نون غنہ آخر میں) لکھنے سے ان الفاظ کا درست تلفظ سامنے نہیں آتا۔ ایسے مواقع پر اردو لغت بورڈ کی لغت میں اور فرہنگِ تلفظ میں بھی نون غنے کی وضاحت کے لیے اس کے اوپر الٹا جزم بنایا گیا ہے (یوں سمجھ لیجیے کہ اردو کے آٹھ کے ہندسے یعنی ۸ کو سر کے بل کھڑا کر دیا ہے)۔ گویا پانو لکھ کر اس کے نون کے اوپر الٹا جزم بنے گا تا کہ واضح ہو سکے کہ یہ نون نہیں ہے بلکہ نون غنہ ہے اور لوگ ''پانو'' میں ''پا'' کو الگ اور ''نو'' کو الگ نہ پڑھیں، بلکہ اسے ''پاں ؤ'' پڑھیں۔ حقی صاحب نے فرہنگِ تلفظ میں جو علامات درج کی ہیں ان میں یہ الٹا جزم بھی موجود ہے۔ غنے کی یہ صورت اردو کے کئی دیگر الفاظ میں بھی ہے جیسے چاند، کانٹا اور آنچل میں۔ حقی صاحب نے فرہنگ تلفظ میں اس نون غنے کو حرکتِ مغنونہ قرار دیا ہے اور فرہنگ میں ایسے الفاظ جن میں یہ نون غنہ آیا ہے کے تلفظ کی وضاحت میں اسے ''مغ'' کے مخفف سے ظاہر کیا ہے۔ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ان الفاظ (چاند، کانٹا اور آنچل) کا درست تلفظ علی الترتیب ''چاں د''، ''کاں ٹا'' اور ''آں چل'' ہے (یعنی نون غنے کے ساتھ) اور اسے نون کے ساتھ یعنی ''چان د''، ''کان ٹا'' اور ''آن چل'' نہیں بولنا چاہیے۔

لیکن ایک اور نون غنہ بھی ہوتا ہے جو اس نون غنے سے مختلف ہوتا ہے جس کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے۔ یہ وہ نون غنہ ہے جو لفظ کی آواز میں شامل ہے۔ اس کی مثال لفظ ''جنگ'' ہے۔ اس میں نون غنے کی آواز تلفظ کا اس طرح حصہ ہے کہ گاف کی آواز کے ساتھ اس کی ملی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح لفظ کنگال اور تنگی میں بھی۔ ایسے نون غنے کو حقی صاحب فرہنگ تلفظ میں غنہ کہتے ہیں اور اسے ''غنہ'' کی علامت سے تلفظ بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فتحہ مغنونہ، کسرۂ مغنونہ، ضمۂ مغنونہ اور میم بشکلِ نون کے لیے با قاعدہ علامات وضع کیں اور فرہنگِ تلفظ میں ان کو برتا بھی۔ (البتہ آئی پی اے IPA کی علامت [ŋ] کی وضاحت نہیں کی)۔

اس لحاظ سے فرہنگ تلفظ اردو میں تلفظ کے مسائل کے حل کی نظری (theoretical) کوشش بھی ہے اور عملی (practical) اور اطلاقی (applied) نمونہ بھی۔ حقی صاحب اہل زبان بھی تھے اور زباں داں بھی۔ لغت، قواعد، تلفظ اور تصرفات پر ان کی نظر تھی اور صوتیات و لسانیات پر ان کا عمیق مطالعہ تھا۔ یہ تمام صفات اس فرہنگ میں جھلکتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بہت اہم اور قابل ستائش کام ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کا تفصیلی جائزہ اب تک نہیں لیا گیا۔

فرہنگ تلفظ کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں مقتدرہ نے شائع کیا۔ اگرچہ اس دوسرے ایڈیشن پر بھی سہواً ''طبع اول'' درج ہو گیا ہے لیکن اس کے پیش لفظ میں مقتدرہ کے اس وقت کے صدر نشین فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ:

> ''فرہنگ تلفظ کے پہلے ایڈیشن کو اردو کے عام اہل ذوق، اساتذہ، طلبہ اور علمی موضوعات پر کام کرنے والوں نے اسے [کذا] مفید مطلب پایا تھا۔ یہ نیا ایڈیشن یقیناً اس افادیت میں اضافہ کرے گا''۔[۲۵]

اس دوسرے ایڈیشن میں کہیں کہیں معمولی تبدیلی کی گئی ہے اور بعض اندراجات کو، غالباً رضوان علی ندوی کی ابتدائی تنقید (جو پہلے ایک مضمون اور بعد ازاں ایک کتابچے کی صورت میں تھی) کے بعد خارج کر دیا گیا ہے اور دوسرے ایڈیشن میں ان الفاظ کی خالی جگہوں پر دائرے بنا دیے گئے ہیں (غالباً اس لیے کہ پوری کتاب ازسرِ نو کمپوز نہ کرنی پڑے)۔

فرہنگ تلفظ کی ایک اشاعت ۲۰۰۸ء میں بھی عمل میں آئی اور اس وقت مقتدرہ کے سربراہ فتح محمد ملک صاحب تھے۔ اس ایڈیشن کی ابتدا میں فرہنگ تلفظ کی پہلی اشاعت (۱۹۹۵ء) کو طبع اول، دوسری اشاعت (۲۰۰۲ء) کو طبع دوم اور اس اشاعت (۲۰۰۸ء) کو طبع سوم لکھا گیا ہے۔ اس تیسری اشاعت میں دوسرے ایڈیشن میں مطبوعہ ملک صاحب کا پیش لفظ بھی موجود ہے۔ فرہنگِ تلفظ کا ایک ایڈیشن ۲۰۱۲ء میں بھی شائع ہوا جس پر طبع چہارم لکھا ہوا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں اس وقت کے صدر نشین انوار احمد نے بشیر احمد ناظم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے:

> ''اس مستند کتاب میں جگہ پانے والی غلطیاں رفع کر دی ہیں''۔[۲۶]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی تصحیح نہیں کی گئی اور اسے پچھلی طباعت کا عکس ہی سمجھنا چاہیے۔

ادارے نے حال ہی میں اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے جو کمپیوٹر پر حروف کاری کے بعد خطِ نستعلیق میں شائع ہوا ہے ۲۷۔ خطِ نستعلیق میں فرہنگِ تلفظ کی یہ پہلی طباعت ہے لیکن یہ دراصل اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن ہے۔ نئے ایڈیشن میں ادارے کے ناظم اعلیٰ افتخار عارف صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''ہمیں یقین ہے کہ فرہنگِ تلفظ کا نستعلیق ایڈیشن اردو دنیا میں لائق پزیرائی [کذا: پذیرائی میں ذال چاہیے] ٹھہرے گا اور استفادے کی نئی راہیں پیدا ہوں گی''۔ ۲۸

لیکن تازہ ایڈیشن جہاں باعثِ اطمینان ہے اور نستعلیق میں تشریح کی وجہ سے دل کش بھی ہو گیا ہے (اس ایڈیشن میں بھی لفظ کا اندراج اور تلفظ نسخ ہی میں درج ہیں جو تکنیکی مجبوری تھی) وہاں اس میں کچھ کمی بھی ہے۔ مثلاً اونھ اور اونگھ وغیرہ میں جو نون غنہ ہے اور اس کی وضاحت پہلے ایڈیشن میں اعرابِ مکتوبی کے ذریعے یعنی الٹا جزم بنا کر کی گئی تھی، وہ الٹا جزم اس ایڈیشن سے غائب ہے۔ اسی طرح حقی صاحب کے بنائے ہوئے مجہول اعراب (مثلاً ضمۂ مجہول کے لیے الٹا پیش) کی علامات بھی ناپید ہیں۔ شاید ان علامات کو کمپیوٹر سے متن میں شامل کرنا ممکن نہ تھا۔ فہرست میں تو یہ نام مثلاً فتحۂ مجہول، ضمۂ مجہول اور کسرۂ مجہول موجود ہیں لیکن ان کے آگے اعراب کی شکل بنانے کی بجائے ڈیش ڈال دیا گیا ہے یا جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ فرہنگ کے متن میں بھی یہ اعراب کہیں نظر نہیں آتے۔ ماتحت عملے نے سوچا ہو گا کہ اب اس کھکیڑ میں کون پڑے۔ ممکن ہے وہ سمجھ ہی نہ سکیں ہوں کہ یہ نشانات کیا چیز ہیں اور ان کی اس فرہنگ میں کیا اہمیت ہے لیکن حقی صاحب کے کام کی انفرادیت بھی اس سے ختم ہو گئی۔

امید ہے کہ اس کے اگلے ایڈیشن میں ان اعراب اور علامات کو بحال کر دیا جائے گا تاکہ اس فرہنگ کی جو امتیازی خصوصیت ہے وہ برقرار رہ سکے اور اردو کے سینکڑوں الفاظ کا درست تلفظ جو مجہول حرکات کی مدد سے واضح کیا جاتا ہے، درست طور پر سامنے آسکے۔

حواشی:

۱۔غلام مصطفیٰ خاں، جامع القواعد،حصہ نحو،لاہور: مرکزی اردو بورڈ،۱۹۷۳ء، بارِ اول،ص۱۹۹۔

۲۔حاتم نے کئی الفاظ متروک قرار دیے مثلاً ''سی'' کے بجائے ''سے'' کو رواج دیا، بعض الفاظ میں ساکن و متحرک کو وزن اور لغت کے لحاظ سے درست قرار دیا مثلاً مَرَض ،بعض کا املا بھی درست کیا، مثلاً تسبیح بجائے تسی اور بیگانہ بجائے بگانہ۔اسی طرح ادھر اور کیدھر کی بجائے ادھر اور کدھر لکھنے کو ترجیح دی۔اس کی وضاحت انھوں نے اپنے دیوان کے فارسی دیباچے میں کی ہے۔تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: شیخ ظہور الدین حاتم ، دیباچہ، دیوان زادہ (مرتبہ غلام حسین ذوالفقار)،لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب،۱۹۷۵ء، ص۴۰۔۳۹

۳۔دیکھیے :سید انشاء اللہ خاں انشاء، دریاے لطافت (مترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی) کراچی: انجمن ترقیٔ اردو،۱۹۸۸ء، ص۲۲۹۔۲۲۷

۴۔جامع القواعد،محولۂ بالا،ص۲۰۱۔

۵۔تفصیلات کے لیے: علمی نقوش، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ،س۔ن،ص۱۴۸۔۱۰۵

۶۔اردو املا، دہلی: قومی کونسل براے فروغ اردو زبان،۱۹۹۸ء، حاشیہ،ص۱۵۱(دوسرا ایڈیشن)۔

۷۔دیکھیے :مسعود ہاشمی کی کتاب : اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۹۲ء، ص۸۲۔مسعود ہاشمی کی اس بات سے نذیر آزاد بھی اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فرہنگِ آصفیہ میں تلفظ کی صراحت کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود ہاشمی نے دھوکا کھایا ہے۔ملاحظہ ہو نذیر آزاد کی کتاب: اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ،۲۰۱۲ء، ص۴۹۔

۸۔ملاحظہ ہو: فرہنگِ آصفیہ،۴ جلدیں، مرتبہ سید احمد دہلوی، لاہور: اردو سائنس بورڈ،۱۹۷۷ء، عکسی ایڈیشن۔

۹۔دیکھیے: امیر اللغات، مرتبہ امیر مینائی، جلد اول و دوم (یک جا)،لاہور: سنگ میل،۱۹۸۹ء۔عکسی ایڈیشن۔

۱۰۔دیکھیے: نور اللغات، مرتبہ نور الحسن نیر، چہار جلد، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء، طبع سوم، عکسی ایڈیشن۔

۱۱۔اے سی گمسن (A.C. Gimsom) (مدیر)، دیباچہ، Englsih Pronouncing Dictionary،لندن: جے ایم ڈینٹ اینڈ سنز،۱۹۷۷ء، چودھواں ایڈیشن۔

۱۲۔ایضاً، نیز ڈینیل جونز کی زندگی اور اس کے کاموں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: Key Thinkers in Linguistics and Philosophy of Languge ، (مرتبہ سایو بہان چیپ مین و دیگر Siobhan Chapman & others)، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،۲۰۰۵ء،(اشاعتِ نو)

۱۳۔گیان چند جین،عام لسانیات،دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۵ء،ص ۷۸۔۷۷

۱۴۔اے سی گمسن (A.C. Gimsom) (مدیر)،دیباچہ،محولہ بالا۔

۱۵۔ایضاً۔

۱۶۔تعارف، English pronouncing dictionary،کیمرج،۲۰۰۶ء،سترھواں ایڈیشن،طباعتِ نو ۲۰۰۷ء۔

۱۷۔نقوشِ سلیمانی،کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۷ء،ص ۳۳۳۔دوسرا پاکستانی ایڈیشن۔

۱۸۔آبِ حیات(مرتبہ ابرار عبدالسلام)ملتان:بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی،۲۰۰۶ء،ص ۲۶۴۔

۱۹۔ایضاً۔

۲۰۔ملاحظہ ہو رشید حسن خان کا طویل مضمون''صحتِ الفاظ''،مشمولہ زبان اور قواعد،دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۱ء،تیسرا ایڈیشن۔

۲۱۔ملاحظہ ہو:اردو لغت:تاریخی اصول پر،جلد ۱۹،کراچی:اردو لغت بورڈ،۲۰۰۳ء۔

۲۲۔نقوشِ سلیمانی،کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۷ء۔

۲۳۔پیش لفظ،فرہنگِ تلفظ(مرتبہ شان الحق حقی)،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۵ء،اشاعتِ اول۔

۲۴۔عرضِ مرتب،فرہنگ تلفظ،اشاعتِ اول محولہ بالا۔

۲۵۔پیش لفظ،فرہنگِ تلفظ،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۲ء،طبعِ دوم۔

۲۶۔پیش لفظ،فرہنگِ تلفظ،اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۱۲ء۔حقیقت یہ ہے کہ بہت تلاش کرنے کے باوجود پچھلے ایڈیشن اور ۲۰۱۲ء کے''تصحیح شدہ''ایڈیشن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔وصی اللہ کھوکھر صاحب نے بھی راقم کے اس تاثر کی تائید کی اور بتایا کہ انھوں نے پوری لغت لفظ بہ لفظ دیکھ لی ہے لیکن پرانے اور نئے تصحیح شدہ ایڈیشن میں کوئی فرق نہیں۔

۲۷۔ڈاکٹر عطش درانی(مرحوم)نے ۲۰۱۷ء میں فرہنگ تلفظ کے نئے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد متعلقہ وفاقی وزارت کے معتمد کو ایک خط لکھا جس کی ایک نقل بھی راقم الحروف کو ارسال کی۔یہ خط ۱۲/اکتوبر ۲۰۱۷ء کو لکھا گیا ہے اس میں انھوں نے جہاں کچھ شکوے کیے ہیں وہاں فرہنگ تلفظ پر کچھ اعتراضات اور انکشافات بھی کیے ہیں(دراصل وہ اس لغت کی پہلی اشاعت کے وقت مقتدرہ ہی میں تھے اور بعد میں بھی رہے)۔۲۵/جنوری ۲۰۱۸ء کو شام پانچ بجے عطش صاحب نے راقم کو فون کیا اور جہاں اور بہت سی باتیں اس لغت سے متعلق بتائیں ان میں سے ایک بات یہ بھی کہی کہ فرہنگ تلفظ کے پہلے ایڈیشن میں لفظ''محبت''شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔

اس کے علاوہ آٹھ (۸) صفحات کا ایک فرما بھی نہیں چھپا تھا۔ بعد کے ایڈیشنوں میں کوئی ترمیم، اضافہ یا تصحیح نہیں ہوئی اور انوار صاحب نے بھی کوئی نیا ایڈیشن نہیں چھاپا، صرف پرانے ایڈیشن پر اپنا پیش لفظ لگا کر کام چلالیا تھا۔ عطش صاحب کی اس بات کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ موجودہ ایڈیشن میں بھی لفظ محبت شامل نہیں ہے۔

۲۸۔ پیش گفتار، فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: ادارۂ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۷ء، اشاعت چہارم۔

مآخذ:

ا۔ احمد، انوار، پیش لفظ، فرہنگِ تلفظ، (مرتبہ شان الحق حقی) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

ا۔ انشاء، سید انشاء اللہ خاں، دریائے لطافت (مترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی) کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء۔

۲۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات (مرتبہ ابرار عبدالسلام) ملتان: بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء۔

۳۔ آزاد، نذیر، اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ جین، گیان چند، عام لسانیات، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۷۸۔۷۷

۵۔ چیپ مین، سایو بہان و دیگر (Siobhan Chapman & others)، (مرتبین)، Key Thinkers in Linguistics and Philosophy of Languge، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء (اشاعتِ نو)

۶۔ حاتم، شیخ ظہور الدین حاتم، دیباچہ، دیوان زادہ (مرتبہ غلام حسین ذوالفقار)، لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۷۵ء۔

۷۔ حقی، شان الحق، عرضِ مرتب، فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، اشاعتِ اول۔

۸۔ خاں، غلام مصطفیٰ خاں، جامع القواعد، حصہ نحو، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء، بارِ اول، (مرکزی اردو بورڈ کا موجودہ نام اردو سائنس بورڈ ہے)۔

۹۔ خاں، غلام مصطفیٰ، علمی نقوش، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، س۔ن

۱۰۔ خاں، رشید حسن، اردو املا، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، (دوسرا ایڈیشن)۔

۱۱۔ خاں، رشید حسن، زبان اور قواعد، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء، تیسرا ایڈیشن۔

۱۲۔ عارف، افتخار، پیش لفظ، فرہنگِ تلفظ (مرتبہ شان الحق حقی)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،

۱۹۹۵ء، اشاعت اول۔

۱۳۔ عارف، افتخار عارف، پیش گفتار، فرہنگ تلفظ، (مرتبہ شان الحق حقی)، اسلام آباد: ادارۂ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۷ء، اشاعتِ چہارم۔

۱۴۔ گمسن، اے سی گمسن (Gimsom, A. C.) (مدیر)، دیباچہ، Englsih Pronouncing Dictionary، لندن: جے ایم ڈینٹ اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء، چودھواں ایڈیشن۔

۱۵۔ ملک، فتح محمد، پیش لفظ، فرہنگِ تلفظ، (مرتبہ شان الحق حقی) اسلام آباد. مقتدرہ قوم زبان، ۲۰۰۲ء، اشاعت ثانی۔

۱۶۔ ندوی، سید سلیمان، نقوشِ سلیمانی، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء، پاکستانی ایڈیشن۔

۱۷۔ ہاشمی، مسعود، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۲ء۔

اردو لغات:

۱۔ اردو لغت: تاریخی اصول پر، جلد ۱۹، کراچی: اردو لغت بورڈ، ۲۰۰۳ء۔

۲۔ امیر اللغات، مرتبہ امیر مینائی، جلد اول و دوم (یک جا)، لاہور: سنگ میل، ۱۹۸۹ء، عکسی ایڈیشن۔

۳۔ فرہنگِ آصفیہ، ۴ جلدیں، مرتبہ سید احمد دہلوی، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء، عکسی ایڈیشن۔

۴۔ فرہنگِ تلفظ، مرتبہ شان الحق حقی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، اشاعتِ اول۔

۵۔ فرہنگِ تلفظ، مرتبہ شان الحق حقی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، طبع دوم۔

۶۔ فرہنگِ تلفظ، مرتبہ شان الحق حقی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، طبع چہارم۔

۷۔ فرہنگ تلفظ، مرتبہ شان الحق حقی، اسلام آباد: ادارۂ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۷ء، اشاعتِ چہارم۔

۸۔ نور اللغات، چار جلدیں، مرتبہ نور الحسن نیر، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء، طبع سوم، عکسی ایڈیشن۔

انگریزی لغات:

۱۔ Englsih Pronouncing Dictionary، لندن: جے ایم ڈینٹ اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء، چودھواں ایڈیشن۔

۲۔ English Pronouncing Dictionary، کیمبرج، ۲۰۰۶ء سترھواں ایڈیشن، طباعت نو ۲۰۰۷ء۔

مہذب اللغات اور اصول لغت نویسی

سید محمد میرزا مہذب لکھنوی اردو کے علمی حلقوں یا کم از کم پاکستان کے ادبی حلقوں میں کوئی بہت زیادہ معروف نام نہیں ہے۔ ان کی مرتبہ ''مہذب اللغات'' بھی پاکستان میں زیادہ معروف نہیں ہے حالانکہ چودہ (۱۴) جلدوں پر مبنی یہ اردو بہ اردو لغت انھوں ۔ نے تن تنہا تقریباً نصف صدی کی محنتِ شاقہ سے مرتب کی۔

مہذب اللغات ہندوستان میں مرتب کی گئی اردو کی ضخیم ترین لغت ہے۔ پاکستان میں مرتب کی گئی اردو لغت بورڈ (کراچی) کی مرتبہ بائیس (۲۲) جلدوں پر مشتمل لغت ''اردو لغت (تاریخی اصول پر)'' اردو کی ضخیم ترین اور بسیط ترین لغت ہے اور اس کے بعد ضخامت کے لحاظ سے مہذب اللغات ہی کا درجہ ہے۔ البتہ اردو کی ایک ضخیم لغت جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے وہ راجیشور راو اصغر کی مرتبہ ''قاموس الہند'' ہے۔ یہ پچپن (۵۵) جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کا واحد قلمی نسخہ (مبنی بر پچپن اَجلاد) جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری میں موجود محفوظ ہے[۱]۔

مہذب اللغات اردو کی ضخیم ترین لغات میں شامل ہے اور اس کا شمار بیسویں صدی کی اہم اردو لغات میں ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ اس کارنامے کی توصیف اس طرح نہ ہوئی جس طرح ہونی چاہیے تھی اور تعریف کی بجائے مولف کے حصے میں زیادہ تر تنقید اور اعتراضات ہی آئے۔ یہ درست ہے کہ مہذب اللغات میں کچھ کم زوریاں ہیں اور اس پر اٹھائے گئے بعض اعتراضات بالکل بجا ہیں (ان کی تفصیل آگے آرہی ہے) لیکن یوں دیکھا جائے تو اردو کی کون سی لغت ہے جس پر اعتراض نہیں ہوا۔ فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، جامع اللغات اور حتیٰ کہ اردو لغت بورڈ کی مرتبہ بائیس جلدی لغت پر بھی خاصے اعتراضات کیے گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ فردِ واحد نے طویل

عرصے کی محنت کے بعد اردو کی ایک ضخیم لغت مرتب کی اور اردو زبان کی خدمت کی۔

☆ کچھ مولف کے بارے میں

سید محمد میرزا مہذب لکھنوی ۶ رجنوری ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۲۔ اپنے والد سید عسکری میرزا مودب سے تلمذ تھا۳۔ مہذب لکھنوی کا ۴رنومبر ۱۹۸۵ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۴۔ اس وقت تک ان کی لغت کی تیرہ جلدیں چھپی تھیں۔ آخری اور چودھویں جلد کی اشاعت ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔

میرزا مہذب لکھنوی کی مصنفہ و مرتبہ و مدوّنہ دیگر کتب میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۵:

۱۔ افکارِ تعشق (جلد اول): سید میرزا تعشق کے سات غیر مطبوعہ مرثیوں کا مجموعہ۔

۲۔ افکارِ تعشق (جلد دوم): سید میرزا تعشق کے چھے منتخب مرثیوں کا مجموعہ۔

۳۔ وقارِ انیس (جلد اول و دوم): مرثیوں کا مجموعہ۔ ان میں دو غیر مطبوعہ مرثیے بھی شامل ہیں۔

۴۔ شعارِ دبیر: سات مرثیے مع دو غیر مطبوعہ مرثیے۔

۵۔ معیارِ کامل: علی میاں کامل کے سات غیر مطبوعہ مرثیے۔

۶۔ آثارِ عشق: سید حسین میرزا عشق لکھنوی کے غیر مطبوعہ مراثی۔

۷۔ گلزارِ رشید: سید مصطفیٰ میرزا (المعروف بہ پیارے صاحب رشید لکھنوی) کے سات غیر مطبوعہ مراثی۔

۸۔ بہارِ مؤدب: مؤدب لکھنوی کے سات غیر مطبوعہ مراثی۔

۹۔ نگارِ نفیس: نفیس لکھنوی (جانشینِ انیس) کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مراثی۔

۱۰۔ اسرارِ محن: مختلف مرثیہ نگاروں کے مراثی۔

۱۱۔ اذکارِ محن: واجد علی شاہ اور دیگر مرثیہ نگاروں کے مراثی۔

۱۲۔ مختارِ وحید: وحید (جانشینِ اُنس) کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مرثیے۔

۱۳۔ شاہ کارِ سخن: انیس، دبیر، مونس و دیگر کے مراثی۔

۱۴۔ مرثیۂ نفیس مع اصلاحِ انیس: نفیس کا مرثیہ جس پر انیس کے قلم سے اصلاح دی گئی ہے۔

۱۵۔ مراثی ٔ میر: میر تقی میر کے اکتیس مرثیوں کا مجموعہ۔

۱۶۔ آیاتِ مصحفی: مصحفی کا غیر مطبوعہ دیوان۔

۱۷۔ گلستانِ رشید: پیارے صاحب رشید کی غزلیات کا مجموعہ۔

۱۸۔ بازارِ سخن: مختلف شعرا کی غزلیات کا انتخاب۔

۱۹۔ دورِ تعشق: تعشق لکھنوی کی سوانح اور کلام۔

۲۰۔ دورِ شاعری: فنِ شعر سے متعلق معلومات۔

۲۱۔ مراثیِ مہذب: مہذب لکھنوی کے مرثیے۔

مہذب کی کتابوں کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم مہذب اللغات کی طرف آتے ہیں۔

☆ مہذب اللغات کی تالیف واشاعت کا آغاز

مہذب اللغات کی تالیف کا آغاز، بقول خود مولف کے، ۱۹۳۸ء سے پہلے کیا جا چکا تھا۔ لکھتے ہیں کہ "میری خستہ وشکستہ آواز پر سب سے پہلے ۱۹۳۸ء یا اس سے کچھ قبل عالی جناب راجہ [کذا: راجا چاہیے] محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر بالقابہ (راجہ [کذا] آف محمود آباد، اودھ) نے انتہائی توجہ ظاہر فرمائی" ٦۔ راجا صاحب محمود آباد کی اعانت کے بعد مہذب لکھنوی خاصے عرصے تک لغت کی ترتیب کا کام اطمینان سے کرتے رہے۔ انھوں نے پہلی جلد کے مقدمے میں کئی اور لوگوں کے نام دیے ہیں جنھوں نے بعد ازاں ان کی مدد کی۔

مہذب اللغات پہلے قسط وار یعنی کرّاسوں کی شکل میں شائع ہونا شروع ہوئی۔ کراسہ یعنی کاغذوں کی گڈی یا پلندہ؛ نیز کسی کتاب کی قسط اس گڈی کی صورت میں ہو تو اسے بھی کراسہ کہتے ہیں اور یہ عموماً بغیر کسی جلد کے چھپتی ہے (انگریزی میں اسے fascicle کہتے ہیں)۔ اوکسفرڈ کی شائع کردہ انگریزی کی عظیم ترین اور ضخیم ترین لغت بھی ابتداءً کراسوں کی شکل میں شائع ہوئی۔ اسی طرح پنجاب یونی ورسٹی کا تیئیس (۲۳) جلدوں میں شائع کردہ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (یعنی اردو کا اسلامی انسائیکلو پیڈیا) بھی پہلے کراسوں کی شکل میں چھپتا رہا۔

مہذب لکھنوی نے دوسری جلد کے مقدمے میں بتایا ہے کہ مہذب اللغات کی پہلی قسط ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ اس قسط (جو کراسے کی شکل میں تھی) کا ایک مطبوعہ نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ نسخہ راقم کی نظر سے گزرا ہے اور اس کی لوح پر "قسط اول" اور "الف مقصورہ" کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ اس کے آخر میں "صاحبانِ ذوق و

ادب'' کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ ''اتنا مکمل لغت آج تک آپ کی نظر سے نہ گزرا ہوگا'' (لکھنؤ میں لغت کے لیے بالعموم مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اگر چہ اب ہمارے ہاں مونث کا زیادہ رواج ہوگیا ہے)۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہ لغت سولہ (۱۶) جلدوں پر مشتمل ہوگی اور ہر جلد کے ایک ہزار صفحات ہوں گے۔ لیکن منصوبے کے برعکس یہ لغت چودہ جلدوں میں اختتام کو پہنچی اور ہر جلد کے پانچ سو صفحات تھے۔ پہلی جلد کا ایک ایسا ایڈیشن بھی ہے جس کے چار سو صفحات ہیں جبکہ ابو سلمان شاہ جہاں پوری صاحب نے اس کے ایک ایڈیشن کی پہلی جلد کے تین سو چار (۳۰۴) صفحات بتائے ہیں ۷۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ہر ماہ کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں سو (۱۰۰) صفحات شائع ہوں گے۔ اس کے بعد مہذب کے مزید کتنے کراسے شائع ہوئے یہ تحقیق طلب ہے۔ البتہ کتابی صورت میں مہذب کی پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

مہذب اللغات کے اس ابتدائی کراسے کی اشاعت کے بعد اس کے خلاف کسی نامعلوم ناقد نے ''ایک واقف کار'' کے قلمی نام سے ایک مضمون لکھا۔ اگر چہ لب و لہجہ طنزیہ تھا لیکن اس میں اٹھائے گئے بعض اعتراضات بالکل بجا تھے۔ یہ مضمون سہ ماہی ''اردو ادب'' (علی گڑھ) کے دسمبر ۱۹۵۶ء کے شمارے میں ''مہذب اللغات (قسط اول) پر ایک سرسری نظر'' کے عنوان سے شائع ہوا ۸۔ مہذب لکھنوی نے دوسری جلد کے مقدمے میں ''ایک واقف کار'' کے اعتراضات میں سے کچھ کا جواب بھی دینے کی کوشش کی۔

ابو سلمان شاہ جہاں پوری صاحب نے لکھا ہے کہ ''اس لغت کی تیاری میں محمد یونس خالدی کا بڑا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں خالدی صاحب کے چند مضامین اپریل ۱۹۶۱ء کے قومی آواز، لکھنؤ، میں شائع ہوئے تھے'' ۹۔ مہذب لکھنوی نے دوسری جلد کے مقدمے میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم ''واقف کار کے لیے اجنبی کیونکر ٹھہر سکتے ہیں''، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ تنقیدی مضمون بھی محمد یونس خالدی صاحب نے لکھا ہو، لیکن اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔

☆ جلدوں کا تعارف

یہاں مہذب اللغات کی جلدوں کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ مہذب کی چند جلدیں ایسی بھی ہیں جن کے پہلے ایڈیشن پر سالِ اشاعت باقاعدہ طور پر نہیں

لکھا گیا اور ایسی صورت میں مولف کے مقدمے کے آخر میں دی گئی تاریخ کو یہاں سال اشاعت مانا گیا ہے حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ جلد کی اشاعت اسی سال نہ ہوئی ہو اور اس میں سال بھر کی (یا اس سے زیادہ کی بھی) تاخیر ہوگئی ہو (جیسا کہ ہمارے ہاں ہوتا بھی رہا ہے)۔

ایک عام تاثر جو مختلف تحریروں سے ملتا ہے یہ ہے کہ مہذب اللغات کی تیرہ جلدیں ہیں، حالانکہ مہذب کی چودہ جلدیں ہیں اور ان کی تفصیل بھی یہاں دی جارہی ہے۔ اس غلط تاثر کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ مہذب لکھنوی کا ۱۹۸۵ء میں انتقال ہوگیا اور ۱۹۸۲ء تک تیرہ جلدیں ہی شائع ہوئی تھیں۔ چودھویں اور آخری جلد ۱۹۸۹ء میں یعنی مولف کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ مہذب اللغات کی جلدوں اور ان کے مشمولات سے متعلق کچھ بنیادی معلومات پیشِ خدمت ہیں:

شمار	جلد	مشمولات	پہلا اندراج	آخری اندراج	تعداد صفحات	سال اشاعت
۱	اول	الف مقصورہ و ممدودہ	ا	آپ موئے تو جگ موا	۵۰۰	۱۹۵۸ء
۲	دوم	آ، ب، پ	آپ میں	پاؤں تھر تھرانا	۵۰۰	۱۹۶۰ء
۳	سوم	پ، ت، ٹ، ث، ج	پاؤں تھمڑا ہوجانا	جنبش ہونا	۵۰۰	۱۹۶۲ء
۴	چہارم	ج، چ، ح، خ، د	جن بن کے لپٹنا	درگزر کرنا	۵۰۰	۱۹۶۶ء
۵	پنجم	د، ڈ، ذ، ر	درگزر کرنا	رخ کرنا	۵۰۰	۱۹۶۸ء
۶	ششم	ر، ز، س	رخِ گلگوں	سَودا زَدہ	۵۰۰	۱۹۶۹ء
۷	ہفتم	س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع	سودا سر لینا	عام الحزن	۵۰۰	۱۹۷۰ء
۸	ہشتم	ع، غ، ف، ق	عام الفیل	قاضی دلال	۵۰۰	۱۹۷۲ء

۹	نہم	ق، ک	قاضی شرع	کمپارٹمنٹ	۵۰۰	۱۹۷۵ء
۱۰	دہم	ک، گ	کمپارٹمنٹل	گھر کی راہ نہ ملنا	۵۰۰	۱۹۷۷ء
۱۱	یازدہم	گ، ل، م	گھر کی سوبھا گھر والی کے سنگ	محرم	۵۰۰	۱۹۷۸ء
۱۲	دوازدہم	م	مُحرم	موم کی ناک	۵۰۰	۱۹۸۱ء
۱۳	سیزدہم	م، ن، و	مومن	وقت تنگ ہونا	۵۰۰	۱۹۸۲ء
۱۴	چہاردہم	ہ، ی	وقت ٹالنا	یہیں کہیں	۳۳۶	۱۹۸۹ء

☆ وجہ تالیف

مولف نے وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو زبان میں ہونے والے ''تغیرات'' اور ان کا زبان پر ''اثر انداز ہونا'' جو، بقول ان کے، ان کی ''طبیعت پر بارِ گراں'' تھا، دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ ''اردو کا ایک ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں لکھنؤ کی خاص زبان محفوظ ہو جائے اور دہلی اور لکھنؤ کے تصرفات کا فرق بھی واضح ہو جائے تا کہ اردو سے دل چسپی رکھنے والے حضرات فصیح و غیر فصیح، مذکر و مؤنث، نیز عوام و خواص کی زبان کا فرق بآسانی سمجھ لیں''۔۱۰

گویا بنیادی مقصد اردو زبان کو ''تغیرات'' سے بچانا، لکھنؤ کی زبان کو محفوظ کرنا اور فصیح و غیر فصیح اور تذکیر و تانیث کا فرق واضح کرنا تھا۔ جہاں تک تغیرات کا تعلق ہے تو ماہرین لسانیات کے مطابق دنیا کی ہر زبان تغیر و تبدیلی کے عمل سے مسلسل گزرتی رہتی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کسی زبان کو جامد رکھا جائے اور تبدیلیوں سے بالکل محفوظ کر دیا جائے۔ اگر کسی زبان کو ماحول اور تغیر سے ''محفوظ'' کرنے کی کوشش کی جائے اور اس پر قدغنیں عائد کی جائیں تو رفتہ رفتہ اس کا چلن

بھی کم ہو جاتا ہے اور وہ مر بھی سکتی ہے۔ زبانیں قدرتی طور پر پھلتی پھولتی ہیں اور تغیر سے آشنا ہوتی ہیں جو دراصل ارتقا ہی کی ایک شکل ہوتی ہے ۔ یہ تغیر و تبدل ہی زبان کی تازگی اور زندگی کی علامت ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر زبان کو ''محفوظ'' کرنے کی بات کی جائے تو سوال اٹھے گا کہ پھر بیسویں صدی کی زبان کی بجائے کیوں نہ سترھویں صدی کی زبان کو محفوظ کیا جائے جو میر تقی میر اور اس دور کے دیگر اہل قلم نے لکھی ہے کیونکہ جو زبان مولفِ مہذب اللغات نے ''محفوظ'' کرنے کی کوشش کی ہے وہ تو خود اس زبان میں بہت زیادہ ''تغیرات'' کا نتیجہ ہے جو مولف کے زمانے سے مثلاً دو سو یا تین سو سال پہلے بولی جاتی تھی۔ لسانیات اور لغت نویسی کے جس بنیادی نکتے کو مولف نے نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ لغت نویسی کا مقصد زبان کو ''محفوظ'' کرنا نہیں ہوتا بلکہ ''موجودہ استعمال کو بیان کرنا'' نیز جو زبان مستعمل ہے اسے ''ریکارڈ کرنا'' ہوتا ہے۔ مولف کا یہ رویہ کہ ہماری زبان کو محفوظ ہونا چاہیے، کسی زمانے میں دوسری زبانوں کے لغت نویسوں اور قواعد نویسوں میں بھی پایا جاتا تھا لیکن بعد میں اس سوچ میں تبدیلی آئی۔ اٹھارھویں صدی کے انگریز قواعد نویسوں پر یہ بہت گراں گزرتا تھا کہ انگریزی زبان میں تغیرات ہو رہے ہیں اور وہ سوچتے تھے کہ اپنی زبان کو کسی طرح ان تبدیلیوں سے محفوظ کیا جائے۔ اُس دور کے بعض انگریز قواعد نویسوں نے بعض ایسی کتابیں بھی لکھیں جن کا مقصد انگریزی کو ''خالص'' اور ''پاک'' رکھنا تھا[11]۔

اس رویے کو ماہرین نے ''تجویزی'' یعنی prescriptive کا نام دیا ہے۔ اس میں گویا تجویز کیا جاتا ہے کہ زبان کو کیسا ''ہونا چاہیے'' یا ''کس طرح استعمال کرنا چاہیے''۔ لیکن اس کے برعکس جدید تحقیق اور لسانیات کے علم پر مبنی رویہ یہ ہے کہ زبان کیسی ''ہے'' یا اب ''کس طرح استعمال کی جا رہی ہے''۔ یعنی تجویز پیش کرنے یا حکم لگانے کی بجائے زبان کے بارے میں یہ تشریح کی جائے کہ اس کا استعمال کس طرح ہو رہا ہے۔ اس سوچ یا اصول کو تشریحی یا بیانی یا وصفی descriptive کا نام دیا گیا ہے۔ گویا لغت نویس، قواعد نویس اور زبان کے ماہر زبان کی تشریح و وضاحت اور استعمال کے موجودہ یا رائج الوقت طریقے بیان کریں[12] نہ کہ اس کے بارے

میں کوئی حکم صادر فرمائیں یا اس کے استعمال کا کوئی نسخہ تجویز فرمائیں کہ اسے کیسے برتنا ہے۔اس طرح جدید تصورات کے مطابق لغت اور قواعد کا مقصد زبان کو ''محفوظ'' کرنا نہیں ہوتا بلکہ انھیں ''بیان'' کرنا یا ان کی تشریح کرنا ہوتا ہے۔اس لحاظ سے مہذب اللغات لغت نویسی کے پرانے اصولوں اور قدیم تصوراتِ زبان کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔اسی سبب اس میں پرانی لغات کی بعض خامیاں در آئی ہیں، مثلاً زبان کے کسی ایک خاص یا محدود یا علاقائی استعمال کو درست سمجھنا اور صرف اسی پر زور دینا۔

ہاں البتہ تاریخی اصولوں پر مرتب کی گئی لغت (جیسے اردو لغت بورڈ کی کلاں لغت ہے) الفاظ کو محفوظ اور ریکارڈ بھی کرتی ہے اور جدید استعمال کو بیان بھی کرتی ہے۔لیکن لغت نویس یا قواعد نویس زبان کے بارے میں حکم لگانے کا اہل نہیں ہے۔وہ یہ تو بتا سکتا ہے کہ پہلے کسی لفظ کا املا یا تلفظ یوں تھا اور اب یوں ہے، یا اس کے یہ معنی تھے اب یہ ہیں، پہلے فلاں لفظ کا استعمال یوں تھا اور اب یوں ہے۔لیکن لغت نویس کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی لفظ کی ایک شکل یا زبان کی کسی ایک صورت یا کسی خاص صورت پر اصرار کرے۔لغت نویس کو چاہیے کہ وہ یہ بتانے کی بجائے کہ ''زبان کیسی ہونی چاہیے'' یہ بتائے کہ ''زبان اب کیسے استعمال کی جا رہی ہے''۔گویا اسے تبدیلیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید تر استعمال کو ''بیان'' کرنا چاہیے اور کوئی نسخہ ''تجویز'' کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔اسی اصول پر اب دنیا بھر میں قواعد، لغت اور لسانیات کے ماہر عمل پیرا ہیں (ماسوائے اس کے کہ تاریخ لکھنے یا تقابل اور موازنے یا قدیم الفاظ کی وضاحت کی کوئی صورت درپیش ہو)۔

لیکن مہذب اللغات کوئی تاریخی اصولوں پر لکھی گئی لغت نہیں ہے۔اسی طرح اس میں قولِ فیصل'' کے تحت جو کچھ مولف نے لکھا ہے وہ بھی بحث طلب ہے (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

☆ تعدادِ اندراجات

مہذب اللغات کی ہر جلد پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے (سوائے آخری جلد کے جس کے تین سو چھتیس صفحات ہیں) اور اس طرح چودہ (۱۴) جلدوں کے تقریباً سات ہزار صفحات بنتے ہیں۔اندازہ ہے کہ اوسطاً ہر صفحے پر بارہ (۱۲) اندراجات ہیں۔اس طرح مہذب اللغات میں

کُل چوراسی یا پچاسی ہزار اندراجات ہوں گے ۔ فی صفحہ اندراجات کا اوسط زیادہ مانا جائے تو اندازہ ہے کہ مہذب اللغات میں نوے یا پچانوے ہزار اندراجات ہوں گے۔ اگر اس میں رعایت بھی کی جائے تو زیادہ سے زیادہ اس تعداد میں پانچ دس ہزار الفاظ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا اس میں ندراجات کی کل تعداد کسی طرح ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن بعض الفاظ کئی کئی بار لکھے گئے ہیں اگر ان کو ایک ہی اندراج شمار کیا جائے تو یہ تعداد اسّی ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔

☆اندراجات کی نوعیت

البتہ اندراجات کی اس تعداد یعنی ایک لاکھ پر جائز طور پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے کیونکہ مہذب لکھنوی نے ایک لفظ کو کئی کئی بار درج کیا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً پہلی جلد میں پہلے اندراج ''الف'' کو چالیس (۴۰) بار بطور اندراج لکھا گیا ہے اور اس کے مختلف معنی ومحلِ استعمال مع اسناد لکھے گئے ہیں۔ دیگر لغات میں ایک ہی لفظ کے معنی کی مختلف شقوں کو اسی ایک اندراج کے تحت نمبر وار درج کیا گیا ہے اور اصولاً ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح پہلی جلد میں لفظ ''اب'' کو سولہ (۱۶) بار لکھ کر اس کے الگ الگ معنی اور محلِ استعمال دیے گئے ہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ ایک لفظ کو لغت میں ایک بنیادی مفرد اندراج یا ہیڈ ورڈ (headword) یا ''راس لفظ'' (جسے اب مغرب کے لغت نویس اور ماہرینِ علم لغت (lexicologist) لیما (lemma) کہتے ہیں) کے طور پر ایک ہی بار درج ہونا چاہیے اور اس کے معنی شق وار، شمار کا عدد دے کر (یعنی ۱۔۲۔۳) لکھنے چاہییں۔ البتہ مہذب میں کہیں کہیں اس طریقے (یعنی ایک ہی لفظ کو کئی کئی بار لکھ کر معنی لکھنے کے طریقے) سے روگردانی بھی کی گئی ہے، مثلاً دوسری جلد میں لفظ ''آگ'' ایک ہی بار لکھ کر مختلف معنی شمار کے عدد (یعنی ایک، دو، تین) کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ یہی درست طریقہ ہے۔ خیال آتا ہے کہ اس طریقے کو ہر جگہ اپنانے میں کیا قباحت تھی؟ کیونکہ اسی جلد میں لفظ ''بس'' کو پانچ بار درج کر کے مختلف معنی بتائے گئے ہیں۔ گویا مہذب کے اندراجات کی تعداد ایک لاکھ نہیں ہے بلکہ ایک لفظ کے متعدد اندراجات کو ایک ہی لفظ تصور کیا جائے تو اس تعداد میں (راقم کا اندازہ ہے کہ) بیس ہزار تک کی کمی ہو سکتی ہے۔

لغت کے اندراجات اور ان کی ترتیب کے ضمن میں یہاں ایک وضاحت ضروری ہے اور یہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ لغت میں ایک لفظ کے اندراج کو لغت کی زبان میں بنیادی مفرد اندراج یا ''اینٹری'' (entry) کہتے تھے (کچھ لوگ اب بھی کہتے ہیں)۔ پھر اس کو ''راس لفظ'' یا ہیڈ ورڈ (headword) کہا جانے لگا اب اس کا نام جدید لغت نویسی میں ''لیما'' (lemma) کر دیا گیا ہے[۱۳]۔ راس لفظ یا لیما اپنے تمام معنی کے ساتھ لغت میں ایک ہی بار لکھا جاتا ہے اور اس کے مختلف معانی شمار کا عدد الگ الگ لکھ کر (یعنی ۱۔۲۔۳) بیان کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر معنی کے لحاظ سے کسی لفظ کی قواعدی حیثیت بدل رہی ہے (مثلاً لفظ ''جوان'' کو لیجیے کہ صفت بھی ہے اور یہ اسم بھی ہو سکتا ہے) تو بھی اس کا بنیادی اندراج ایک ہی بار ہوگا، البتہ اس کے مختلف معنی اسی بنیادی اندراج کے تحت مختلف قواعدی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے لکھے جائیں گے۔ مثال کے طور پر اردو لغت بورڈ کی لغت میں ایسے مواقع پر پہلے شق ''الف'' بنائی جاتی ہے اور وضاحت کی جاتی ہے کہ یہ صفت ہے اور اس کے معنی (اگر ایک سے زیادہ ہوں تو نمبروار یعنی ایک، دو تین کے ہندسے لکھ کر) بتائے جاتے ہیں۔ پھر دوسری شق ''ب'' بنا کر وضاحت کی جاتی ہے کہ یہ اسم ہے اور مذکر ہے (یا مونث ہے) اور پھر اس کے معنی بتائے جاتے ہیں۔

ہاں کسی لفظ کو اسی ہجے اور اسی اعراب کے ساتھ ایک سے زیادہ بار بطور مفرد بنیادی اندراج لکھا جا سکتا ہے اور لکھنے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ لفظ مختلف زبانوں کے ہوں، مثلاً لفظ ''جان'' کو لیجیے۔ عربی میں اس کے معنی ''جن'' کے ہیں (جس کی جمع کے طور پر ہم اردو میں جنات کا لفظ استعمال کرتے ہیں)۔ لیکن فارسی میں اس کے معنی زندگی یا روح کے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ محبوب و معشوق، بہت پیارا، قوت و طاقت، زور اور ہمت، وغیرہ کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ البتہ اردو میں یہ واقفیت یا شناسائی یا علم (جاننا سے، مثلاً وہ جان گیا) کے معنی میں آتا ہے۔ لہٰذا لفظ ''جان'' کا اندراج بطور راس لفظ یا لیما (lemma) کسی بھی اردو لغت میں تین بار الگ الگ کرنا ہوگا یعنی جان (۱)، جان (۲) اور جان (۳) (شمار کا یہ عدد لفظ سے ذرا اوپر اٹھا کر خفی قلم سے لکھا جاتا ہے)۔ پھر اس اندراج کی اصل کے لحاظ سے اس کی وضاحت کرنی ہوگی کہ یہ اصلاً کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے جتنے مختلف معنی اس زبان کے لحاظ سے اردو میں رائج ہوں

گے وہ شمار کا عدد ڈال کر لکھنے ہوں گے۔

ایک اور اہم بات اندراجات اور بنیادی اندراجات کے سلسلے میں یہ ہے کہ کسی لفظ کو لغت میں لکھ کر اس کے تحتی یا ذیلی اندراجات یا محاورے و مرکبات (جنھیں انگریزی میں sub-entries کہنا چاہیے) اس کے ساتھ لکھے جائیں گے اور پھر نیا لفظ شروع ہوگا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ لغت میں پہلے لفظ ''آپ'' لکھا جائے گا لیکن اس کی تشریح اور اشتقاق وغیرہ کی وضاحت کے فوراً بعد اگلا لفظ، جو حروفِ تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے ''آپا'' ہے، نہیں لکھ دیا جائے گا بلکہ لفظ ''آپا'' کے اندراج سے قبل لفظ ''آپ'' کے تمام ذیلی یا تحتی مرکبات، محاورات، کہاوتیں یا اصطلاحات وغیرہ درج ہوں گی (مثلاً آپ آپ کرنا، آپ بیتی، آپ بھلے تو جگ بھلا، آپ کی بلا سے، آپ کے صدقے، آپ ہی آپ وغیرہ)، اور ان کے بعد ہی اگلے لفظ یعنی ''آپا'' کی نوبت آئے گی۔

اب اگر کوئی لفظ تین الگ الگ زبانوں میں ایک ہی ہجے اور یکساں اعراب کے ساتھ آتا ہے اور اردو میں بھی تینوں طرح مستعمل ہے تو اردو کی لغت میں اسے تین بار لکھتے ہوئے اس کے ذیلی اندراجات بھی اسی بنیادی اندراج کے ساتھ دینے ہوں گے۔ اس بات کو اوپر دی گئی لفظ ''جان'' کی مثال سے یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ پہلے مثلاً فارسی کا ''جان'' لکھ کر اس پر ایک کا عدد لکھا جائے گا اور اس کے ذیلی مرکبات اور محاورے اسی کے ساتھ لکھ دیے جائیں گے، مثلاً جان جہاں، جان دریغ نہ کرنا، جانِ من، جان ہے تو جہان ہے، وغیرہ۔ اس کے بعد اردو کے معنی میں آنے والا لفظ جان لکھ اس پر دو کا عدد لکھا جائے گا اور اس کے ذیلی مرکبات مثلاً جان بوجھ کر، جان کے انجان بننا وغیرہ لکھے جائیں گے۔ پھر عربی کا ''جان'' لکھ کر اس کی تشریح کی جائے گی۔ گویا لفظ جان اور اس کے ذیلی یا تحتی اندراجات کسی بھی اردو لغت میں اصولاً یوں ہوں گے:

جان (اس کے ساتھ ایک کا عدد لکھا جائے گا)

معنی (یہاں معنی کی مختلف شقیں ایک، دو، تین، وغیرہ لکھ کر تحریر کی جائیں گی)۔

جان جہاں

جان دریغ نہ کرنا

جانِ من

جان ہے تو جہان ہے

(آخر میں ماخذ زبان کی نشان دہی کے لیے ''فارسی'' لکھا جائے گا)

جان (اس کے ساتھ دو کا عدد لکھا جائے گا)

معنی (معنی کی مختلف شقیں، اگر ہیں تو)

جان بوجھ کر

جان کے انجان بننا

(اور آخر میں ماخذ زبان یعنی سنسکرت یا اردو یا پراکرت لکھا جائے گا)

جان (اس کے ساتھ تین کا عدد لکھا جائے گا)

معنی

اگر اس کے تحتی مرکبات اردو میں رائج نہیں تو ان کا اندراج اردو لغت میں نہیں ہوگا۔

جانا (آخر میں وضاحتاً عربی لکھا جائے گا)

گویا لفظ ''جان'' کے تیسری حیثیت سے اندراج وتشریح اور اس کے ذیلی یا تحتی اندراجات کے بعد ہی لفظ ''جانا'' کا اندراج کیا جاسکتا ہے، اس سے پہلے نہیں۔

لیکن اس طریقۂ کار کے برعکس مہذب میں لفظ ''جان'' کا اندراج نو (۹) بار کیا گیا ہے (جلد سوم، ص ۴۳۷۔۴۳۶) اور اس کے بعد ''جانا'' کا متعدد بار اندراج ہے۔لفظ ''جانا'' کے بعد مہذب اللغات میں پھر ''جان'' کا اندراج ملتا ہے اور ''جان'' کے کچھ تحتی یا ذیلی اندراجات ہیں، مثلاً جان اٹکنا یا جان الجھنا وغیرہ (جلد سوم، ص ۴۳۷)۔اس کے بعد ''جاناں'' اور ''جانانہ'' کا اندراج ہے اور اس کے بعد ایک بار پھر ''جان'' کے تحتی مرکبات شروع ہوجاتے ہیں۔یہ ایک عجیب صورت ہے اور قاری کے لیے شدید الجھن کا باعث کیونکہ اسے فارسی کے جان (بمعنی زندگی) کے بعض تحتی مرکبات (مثلاً جان کے لالے) دیکھنے کے لیے لفظ جان اور اس کے درمیان الف بائی ترتیب سے آنے والے دیگر تمام الفاظ (جن میں سے بعض جان کے تحتی مرکبات ہیں اور بعض دیگر الفاظ کے تحتی مرکبات بھی) دیکھنے ہوں گے۔اس عمل میں قاری کو

فارسی کے جان (مثلاً جان ڈالنا) کے ساتھ اردو کے جان (جو جاننا کا امر ہے) کے بھی خاصے تحتی اندراجات (مثلاً جان کے انجان بننا) سے گزرنا ہوگا اور دیگر الفاظ جن کا جان سے کوئی تعلق نہیں (مثلاً جانا، جاناں، جانانہ، جانب، جانچ، جانچنا وغیرہ) بھی دیکھنے پڑیں گے۔ گویا مہذب میں کسی خاص اندراج کی تلاش آسان نہیں ہے اور اس کی وجہ اندراج کے بنیادی صول کی خلاف ورزی ہے۔ دراصل مہذب نے جان اٹکنا کے اندراج میں اٹکنا کے پہلے الف کو جان کے نون کے بعد شمار کر کے ترتیب قائم کی ہے۔

یہ طریقہ مناسب نہیں ہے اور لغت نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اردو کی متداول لغات ہوں مثلاً فرہنگِ آصفیہ یا انگریزوں کی مرتبہ لغات مثلاً جان پلیٹس کی اردو بہ انگریزی لغت، یا اردو لغت بورڈ کی لغت، ہر لغت نے تحتی یا ذیلی اندراجات کے لیے اسی منقولہ بالا طریقِ اندراج کو معمولی ردوبدل کے بعد اختیار کیا ہے لیکن مہذب نے اس اصول سے واضح روگردانی کی ہے جو سراسر غلط ہے۔ یہ قاری کے لیے بھی الجھن کا باعث ہے اور اصول لغت نویسی کے بھی خلاف ہے۔ اس نامانوس اور مغلق طریقے کی وجہ سے مہذب کا درجہ سائنسی طرز کی لغت نویسی کے لحاظ سے کم ہو جاتا ہے۔

☆ترتیبِ حروفِ تہجی

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے طے کیا تھا کہ ہائیہ یا ہکاری (aspriated) آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروفِ تہجی (مثلاً بھ، پھ، تھ وغیرہ) کو الگ حرفِ تہجی مانا جائے اور لغت میں ان سے شروع ہونے والے الفاظ کے اندراجات کی ترتیب یوں ہو کہ "ب" کے بعد "بھ" سے شروع ہونے والے الفاظ، "پ" کے بعد "پھ" سے شروع ہونے والے الفاظ وعلیٰ ہٰذاالقیاس۔ اس اجتہادی فیصلے سے اردو لغت نویسی کی بہت سی الجھنیں رفع ہو گئیں کیونکہ اس طرح لفظ کو اس کے صحیح مقام پر درج کرنا اور اسے تلاش کرنا آسان ہو گیا ورنہ ہماری متداول لغات میں "بہر" اور "بھر" اور "پہر" اور "پھر" جیسے کئی الفاظ ایک ساتھ درج کیے ہوئے ملتے ہیں۔ ہائیہ یا ہکاری آواز کو الگ حرفِ تہجی کے طور پر الگ تقطیع میں درج کرنے کے اسی اصول پر اردو لغت بورڈ کی لغت مرتب کی گئی جس کے پہلے مدیرِ اعلیٰ بابائے اردو ہی تھے۔ اردو لغت بورڈ نے طے کیا

کہ اردو میں ترپن (۵۳) حروفِ تہجی ہیں اور اسی ترتیب سے لغت مرتب کی گئی۔ لیکن اس پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو اعتراض ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حروفِ تہجی کی تعداد میں یہ اضافہ غیر ضروری اور غیر سائنٹفک ہے۔[۱۴] البتہ مسعود حسین خان نے لسانیات اور علم لغت کی بنیاد پر کہا کہ یہ نہ تو غیر ضروری ہے اور نہ غیر سائنٹفک[۱۵]۔ تعجب ہے کہ جن لوگوں کو اردو حروفِ تہجی کی ترتیب اور تعداد کے ضمن میں عرصے سے چلے آ رہے اختلاف و انتشار پر کبھی اعتراض نہیں ہوا انھیں اس کی باقاعدگی پر اعتراض ہو گیا۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی اپنی کتاب ''لغاتِ روزمرہ'' میں بھی اردو کے حروفِ تہجی کی درست تعداد کے ضمن میں دورنگی ہے۔ وہ اس کتاب میں صفحہ چھیالس (۴۶) پر اردو کے حروفِ تہجی کی تعداد اڑتیس (۳۸) بتاتے ہیں لیکن اسی کتاب کے صفحہ سینتالیس (۴۷) پر انھوں نے یہ تعداد پینتیس (۳۵) لکھی ہے[۱۶]۔ اور یہ دورنگی کتاب کی دوسری اشاعت میں بھی موجود ہے۔

لیکن مہذب اللغات نے حروفِ تہجی کی ترتیب میں ہائیہ یا ہکاری (aspirated) آوازوں کو الگ حرف تہجی نہیں مانا اور لغت میں ہائیہ آوازوں سے شروع ہونے والے الفاظ کو الگ تقطیع میں درج نہیں کیا، مثلاً بجائے اس کے کہ وہ ''ب'' سے شروع ہونے والے الفاظ کی تقطیع کے اختتام کے بعد ''بھ'' سے شروع ہونے والے الفاظ کی تقطیع قائم کرتے، انھوں نے ''ب'' کے ساتھ ہی ''بھ'' سے شروع ہونے والے الفاظ درج کر دیے ہیں۔ مثال کے طور پر مہذب کی دوسری جلد میں ''بہا'' کے بعد ''بھابو'' کا اندراج ہے اور پھر ''بہا بہا پھرنا'' کے بعد بھابی اور بھ سے شروع ہونے والے کچھ مزید الفاظ کے بعد ''بہادر'' درج ہے۔ یعنی ''ب'' اور ''بھ'' سے شروع ہونے والے الفاظ ایک ہی تقطیع کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ یہ طریقہ اردو ہجا کی جدید ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ یہ طریقہ قدیم لغات مثلاً پلیٹس کی لغت اور بعد کے دور کی چند ایک لغات (مثلاً علمی اردو لغت) میں تو ملتا ہے لیکن حروفِ تہجی کی یہ ترتیب جدید اصولوں کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ حروفِ تہجی کی درست ترتیب وہی جو اردو لغت بورڈ کی لغت میں اختیار کی گئی ہے یعنی پہلے مفرد حرف اور پھر اسی حرف کی ہائیہ شکل (جو مرکب حروفِ تہجی بھی کہلاتے ہیں) آئے گی، یعنی پہلے حرف ''ب'' سے شروع ہونے والے الفاظ اور ان سب کے اندراج کے بعد حرف ''بھ'' سے

شروع ہونے والے الفاظ کا اندراج ہوگا۔ لغت میں بقیہ الفاظ کی تقطیع بھی اسی طرح قائم کی جائے گی، یعنی مثلاً پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ج، جھ، چ، چھ، وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

گویا مہذب اللغات میں حروفِ تہجی کی ترتیب قدیم انداز کی ہے اور جدید لغت نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے۔

☆اصولِ ترتیبِ اندراجات

اصولِ ترتیب کے ضمن میں کچھ سطورِ بالا میں ''اندراجات کی نوعیت'' کے ذیل میں عرض کیا گیا۔ یہاں اس پر کچھ مزید روشنی ڈالنا مطلوب ہے۔ مہذب کا اصولِ ترتیبِ اندراجات بھی عجیب ہے۔ اس لغت میں ذیلی یا تحتی اندراج کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ دیگر لغات کے اصولِ اندراج سے قطعی مختلف ہے۔ دیگر لغات میں بالعموم ایک بنیادی مفرد اندراج یا ''راس لفظ'' یا ''لیما'' کے بعد اس لفظ کے ذیل میں آنے والے تمام مرکبات اور محاورات لکھے جاتے ہیں۔ لیکن مہذب نے ہر لفظ اور اس کے ساتھ اس کے تحتی مرکبات میں موجود حروفِ تہجی کی ترتیب کا خیال رکھا ہے اور اسی لیے مہذب میں کسی لفظ یا اس کے ذیلی مرکبات کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ ایک لفظ کا اندراج کرنے کے بعد اس کا ذیلی مرکب یا اس سے شروع ہونے والا محاورہ ممکن ہے کہ کئی صفحات کے بعد ملے۔ اس بات کی وضاحت میں عرض ہے کہ مہذب کی دوسری جلد میں صفحہ ۳۴۶ پر لفظ ''بو'' (خوشبو یا بدبو کے معنی میں) کا اندراج ہے۔ اب اگر کیس قاری کو ''بو نکلنا'' کے معنی دیکھنے ہوں تو وہ اسے ''بو'' کے فوراً بعد ذیلی اندراج کے طور پر نہیں ملیں گے (جیسا کہ عام طور پر اردو لغات میں ہوتا ہے) بلکہ درمیان میں کئی اندراجات مثلاً بوٹا، بوٹی، بوجھ، بوڑھا، بول، بوند اور بونس کے بعد صفحہ ۳۵۹ پر (یعنی تیرہ صفحات کے بعد) ملے گا کیونکہ صاحبِ مہذب نے صرف الفاظ کے حروف کی ترتیب کو مدنظر رکھا ہے اور ''بو نکلنا'' میں چونکہ ب اور واو کے بعد نون ہے تو درمیان میں جتنے حروف واو اور نون سے پہلے آتے ان سے شروع ہونے والے لفظ (مثلاً بوٹا اور بوٹی وغیرہ) پہلے لکھے گئے ہیں۔ اس ترتیب کا مقصد کیا ہے، اس سے کیا فوائد حاصل ہوئے اور قاری کو الجھن میں کیوں ڈالا گیا، اس کی کوئی وضاحت مولف نے نہیں کی ہے۔

گویا مہذب اللغات میں اندراجات کی ترتیب میں ذیلی یا تحتی مرکبات کے اصول کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا ہے جس سے قاری کو بہت مشکل درپیش ہوتی ہے اور کسی خاص تحتی یا ذیلی اندراج کو تلاش کرنا الجھن میں ڈالنے والا کام بن جاتا ہے۔

☆قواعدی حیثیت

مہذب میں اندراج کی قواعدی حیثیت مثلاً اسم، فعل، صفت وغیرہ بالعموم نہیں بتائی گئی ہے، البتہ کہیں کہیں مصدر کے ساتھ ''لازم'' لکھ دیا گیا ہے یا کسی لفظ کے ساتھ ''مذکر'' اور کبھی کسی کے ساتھ ''واحد'' لکھ دیا یا ہے۔ لیکن اس کا بھی با قاعدہ اہتمام نہیں ہے۔ ہاں ''فصیح'' اور ''رائج'' اور ''غیر فصیح'' پر خاصا زور ہے۔ کہیں کہیں ''محلِ صرف'' بھی بتاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کسی باقاعدہ نظام یا اصول کے تحت نہیں ہے۔

☆تلفظ

اردو لغات میں تلفظ واضح کرنے کے چار مختلف طریقے رائج رہے ہیں جو یہ ہیں: (۱) ملفوظی، (۲) مکتوبی، (۳) اعراب بالحروف اور (۴) ہم وزن یا ہم تلفظ الفاظ۔ لیکن ان میں سے دو یعنی مکتوبی اور ملفوظی زیادہ رائج رہے ہیں۔ باقی دو طریقے یعنی اعراب بالحروف اور ہم وزن یا ہم تلفظ الفاظ سے تلفظ بتانے کا طریقہ زیادہ رائج اور پسندیدہ نہیں سمجھا گیا۔ ان چاروں طریقوں کی کچھ تفصیل راقم نے اپنے ایک مقالے میں پیش کی ہے ۱۷ اور اس کو یہاں دہرانا تحصیلِ حاصل ہے (یہ مقالہ اس کتاب میں بھی شامل ہے، ملاحظہ ہو: مسائلِ تلفظ، فرہنگِ تلفظ اور صوتیات)۔

مہذب اللغات میں تلفظ کے ضمن میں ابتدا میں تو مکتوبی اور ملفوظی دونوں طریقوں سے تلفظ واضح کیا گیا ہے، مثلاً پہلی جلد میں لفظ اخباری، اخبث، اخت اور اختتام وغیرہ کا تلفظ دونوں طریقوں (یعنی ملفوظی اور مکتوبی) سے واضح کیا گیا ہے لیکن اسی جلد میں بعض الفاظ کے حروف پر اعراب لگا دیے گئے ہیں یعنی مکتوبی طریقے سے تلفظ بتایا گیا ہے لیکن ملفوظی تلفظ نہیں دیا گیا، جیسے لفظ اجرا، اکرام اور اکراہ کا تلفظ حروف پر اعراب لگا کر واضح کیا۔ لیکن اس میں بھی دورنگی ہے۔ مثلاً لفظ اکڑفوں کا تلفظ بتاتے ہوئے الف اور کاف پر فتحہ (زبر) موجود ہے لیکن واو کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ہے کہ یہ معروف ہے، مجہول ہے یا لین۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ساتھ ہی اکڑ

اور اکڑفوں کا تلفظ دیوناگری حروف میں دے دیا گیا ہے۔ اکڑ تکڑ کا تلفظ بھی اعراب کے علاوہ ناگری میں لکھا گیا ہے۔ کیوں؟ اس کی کوئی وجہ یا اصول بیان نہیں کیا گیا۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ پراکرت یا سنسکرت (مقامی یا اردو یا ہندی کہہ لیجیے) الفاظ کا تلفظ پلیٹس کی لغت کی طرح ناگری میں بھی دیا جارہا ہے تو یہ مفروضہ اس لیے غلط ہو جاتا ہے کہ سینکڑوں مقامی الفاظ کا تلفظ ناگری رسم الخط میں نہیں دیا گیا۔ مثلاً جس صفحے پر جس پر اکڑفوں، اکڑ اور اکڑ تکڑ کا دیوناگری میں تلفظ لکھا گیا ہے اسی صفحے پر اکڑنا بھی درج ہے۔ اسے پانچ بار درج کیا گیا ہے لیکن ایک بار بھی تلفظ ناگری میں نہیں لکھا گیا۔ پھر اس کا تلفظ مکتوبی طریقے سے لکھا گیا ہے اور تعجب ہے کہ اس میں الف پر تو زبر ہے لیکن کاف اور ڑے پر کوئی علامت نہیں ہے، نہ ملفوظی طریقے سے وضاحت کی گئی ہے۔ مزید تعجب یہ کہ اسی لفظ اکڑنا میں ''نا'' کے نون پر زبر ہر بار (یعنی پانچ بار) درج ہے حالانکہ ایسے مواقع پر (مثلاً، نا، جا، لا وغیرہ) اردو میں الف سے پہلے زبر لکھنا بے معنی ہے کیونکہ کسی حرف کے بعد آنے والا الف اس حرف (مثلاً نون) کی آواز کو سہارا دیتا ہے۔ یہاں نون پر زبر کی کوئی تک نہیں ہے۔

لفظ اُمم کا تلفظ بھی مکتوبی طریقے سے دینے کے ساتھ ناگری میں بھی لکھا گیا ہے۔ حالانکہ امم سنسکرت کا نہیں عربی کا لفظ ہے۔ گویا مہذب اللغات میں تلفظ کی وضاحت کا کوئی مخصوص یا طے شدہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے اور جہاں جہاں تلفظ واضح کیا گیا ہے وہاں بھی کوئی یکسانی یا کسی خاص اصول کی پابندی نہیں ملتی۔

☆معنی کا اندراج

مہذب اللغات میں بعض مقامات پر معنی لکھتے ہوئے غیر ضروری طوالت اختیار کی گئی ہے اور اسمائے معرفہ (proper nouns) کی طول طویل وضاحت کی گئی ہے۔ عام لغات میں ایسا نہیں ہونا چاہیے اور یہ صرف انسائیکلوپیڈیائی یعنی دائرۂ معارفی لغت میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ عالم ہے کہ مہذب لکھنوی بعض الفاظ کے صرف ایک معنی دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً پہلی جلد میں لفظ ''آب'' کے صرف ایک معنی (پانی) دیے ہیں اور اس کے بقیہ معنی جو عام سی اور مختصر یا یک جلدی لغات میں بھی مل جاتے ہیں، درج نہیں کیے۔ ''آب'' کے مزید معنی مثلاً ''علمی اردو لغت'' نے یہ بھی دیے ہیں: آنسو، تلوار کا جوہر، عرق، پھلوں کا رس، خالص شراب،

رونق، چمک، عزت، تازگی، اور وضاحت کی ہے کہ ان میں سے بعض معنی میں لفظ ''آب'' بطور مونث استعمال ہوتا ہے، جبکہ پانی کے معنوں میں ''آب'' کا لفظ اردو میں مذکر ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ آب کے صرف ایک معنی درج کرنے کے بعد مہذب نے ایک اور لفظ ''آبا'' کے اندراج کے بعد ''آب اتر جانا کا اندراج کیا ہے اور معنی لکھے ہیں چمک جاتی رہنا، معنی تو بالکل درست ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب لفظ ''آب'' کے بنیادی اندراج میں ''چمک'' کے معنی درج نہیں ہیں تو تحتی یا ذیلی مرکب میں یہ معنی کیسے آسکتے ہیں؟ لطف کی بات یہ ہے کہ اسناد کے بعد لکھا ہے ''یہ آب اردو اور مونث ہے''۔ یہی بات ''آب'' کے معنی نمبر دو کی صورت میں لکھ دی جاتی تو بہتر ہوتا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ جدید لغت نویسی میں اب تشریح پر خاصا زور دیا جاتا ہے اور اس میں مترادفات کا لکھا جانا اتنا اہم نہیں رہا۔ بلکہ اوکسفرڈ کی مختلف انگریزی بہ انگریزی لغات کے پچھلے چند ایڈیشنوں میں مترادفات بہت کم ہیں اور اکثر سادہ (مگر خاصی وضاحت سے لکھی ہوئی) تشریح دے دی گئی ہے، جبکہ ہمارے ہاں تقریباً تمام لغات میں لغت نویسی کو مترادفات کی فہرست سازی سمجھ لیا گیا ہے۔ مہذب کا حال بھی یہی ہے کہ مترادفات کو معنی یا تشریح کا نعم البدل سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ بسا اوقات کوئی لفظ ''مترادف'' تو ہوتا ہے کلی طور پر ''مرادف'' نہیں ہوتا۔ دوسری قباحت مترادفات کا ڈھیر لگانے میں یہ ہے کہ جس بے چارے قاری کو مترادفات میں سے بھی کسی کا مطلب معلوم نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ اگر اس مترادف کے معنی اسی لغت میں دیکھیے تو وہاں پر بھی مترادفات کی قطار اس کا منہ چڑا رہی ہوتی ہے۔ انگریزی لغات میں دیکھیے تو پہلے تشریح ہوگی اور پھر مترادفات اور جدید لغات میں بعض اوقات صرف تشریح۔

مہذب سے یہ توقع تو فضول ہی تھی کہ وہ جدید انداز کی تشریح لکھیں گے لیکن یہ امید بھی نہ تھی کہ وہ ''آب'' کے معنی محض ''پانی'' لکھ کر آگے بڑھ جائیں گے۔ گویا معنی یا تشریح نویسی، جو لغت نویس کا اہم ترین فریضہ ہوتا ہے، مہذب کا ایک کم زور پہلو ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں مہذب نے بعض الفاظ کی عمدہ تشریح بھی کی ہے لیکن ایسی مثالیں کم ہیں۔

☆ قولِ فیصل؟

مہذب اللغات پر ایک اعتراض یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں کئی مقامات پر دیگر لغات سے اختلاف کرتے ہوئے وضاحتی شذرے (نوٹ) دیے گئے ہیں اور اس اختلاف کا فیصلہ ''قولِ فیصل'' کی سرخی کے تحت کیا گیا ہے۔ اول تو لغت نویس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ، بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق، کسی لفظ کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرے اور لغت نویس کا کام صرف الفاظ کو ریکارڈ کرنا ہے[۱۸] اور اس کے لیے اسے سند دینی چاہیے۔ ثانیاً، زبان اور اس کے متعلقات کے بارے میں صرف اپنی رائے کو خود ہی معتبر اور مستند ٹھہرانا علمی رویہ نہیں ہے۔ مسعود ہاشمی کی یہ رائے درست ہے کہ مولفِ مہذب اللغات نے جا بجا فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات سے اختلافِ رائے (غلط یا صحیح) کرکے مہذب اللغات کو لغت کی بجائے لغات کا محاکمہ بنادیا ہے اور یہ تدوین سے نکل کر تنقید کے دائرے میں داخل ہوگئی ہے[۱۹]۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نور اور آصفیہ کی اصلاح کو مہذب لکھنوی نے ضروری سمجھا مگر اس میں بھی پوری طرح کام یاب نہ ہوسکے[۲۰]۔

دیگر علمی اعتراضات بھی ہوسکتے ہیں۔ مثلاً مرتب نے اس میں صرف لکھنؤ کی اردو کو مستند مانا ہے۔ اردو پاکستان اور ہندوستان کے وسیع و عریض علاقوں میں بولی جاتی ہے اور اس کا مختلف علاقوں میں مختلف لہجہ، تلفظ اور محاورہ بھی رائج ہوگیا ہے۔ اس لیے اب اردو کو لکھنؤ تک محدود کرنا تنگ نظری کی بھی علامت ہے۔ لکھنوی استعمال کو فصیح ماننے پر مہذب نے اتنا زور دیا ہے کہ لگتا ہے کہ اردو صرف لکھنؤ کی زبان تھی۔ اس طرح کے لسانی تکبر اور تعصب کی علمی اور تحقیقی کاموں میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ ۱۹۵۸ء میں شروع کی گئی اس لغت میں جدید الفاظ و محاورات بالکل نہیں ہیں کیونکہ اس کی ابتدائی جلدیں آج سے ساٹھ (۶۰) سال پہلے مرتب کی گئی تھیں۔

☆ مہذب اللغات کی اہمیت

ان خامیوں کے باوجود مہذب اللغات کی بہر حال اہمیت ہے۔ ایک اہم بات تو یہ ہے کہ یہ ایک ضخیم لغت ہے اور اس میں اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا خاصا بڑا حصہ سما گیا ہے۔ گویا اس کا شمار اردو کی جامع لغات میں کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آزادی کے بعد لکھی گئی ضخیم لغات میں مہذب بھی شامل ہے۔ پھر اس میں نور اور آصفیہ کا محاکمہ بھی بہر حال مفید ہے اور لغت نویسوں اور زبان و لغت سے دل چسپی رکھنے والوں کو لیے اہم ہے۔ پھر اس میں بعض الفاظ کی بہت عمدہ

تشریح کی گئی ہے۔ مہذب میں بعض ایسے الفاظ و مرکبات کا اندراج بھی ملتا ہے جو اردو کی دیگر لغات حتیٰ کہ اردو لغت بورڈ کی بائیس جلدی لغت میں بھی درج نہیں ہیں۔

مختصراً یہ کہ ''مہذب اللغات'' میں کچھ خوبیاں ضرور ہیں لیکن اس کی ضخامت کے باوجود اسے کوئی بہت معیاری یا سائنٹفک انداز میں مرتب کی ہوئی لغت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کسی فردِ واحد کا تن تنہا اتنی ضخیم لغت مرتب کر لینا اور اس میں عمرِ عزیز کا خاصا بڑا حصہ صرف کر دینا قابلِ ستائش ہے۔ کاش وہ لغت نویسی کے کچھ اصول طے کر کے کام کرتے تو اس لغت کا درجہ بھی بلند ہوتا اور یہ زیادہ مفید اور زیادہ معتبر ہو جاتی۔

حواشی:

۱۔ قاموس الہند سے متعلق دیگر تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: رؤف پاریکھ، علم لغت، لغت نویسی اور لغات (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء)۔

۲۔ مالک رام، تذکرۂ ماہ و سال (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۱ء) ص ۳۷۱؛ نیز بشارت علی خاں فروغ، وفیاتِ مشاہیرِ اردو (دہلی: ناشر مولف، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۸۴۔

۳۔ مالک رام، بحولہ بالا؛ نیز بشارت علی خاں فروغ بحولہ بالا۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ان معلومات میں سے کچھ مہذب اللغات، جلد اول، سے ماخوذ ہیں۔ لکھنؤ: انجمن محافظ اردو، ۱۹۵۸ء، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ص ۵۰۰۔ نیز کچھ کی اطلاع ان کی مطبوعہ کتب سے دست یاب سے ملی۔

۶۔ مہذب اللغات، جلد ۱، ص ج، د۔

۷۔ دیکھیے: کتابیاتِ لغاتِ اردو، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء)، ص ۳۲۔

۸۔ مہذب اللغات پر لکھے گئے نامعلوم نقاد کے تنقیدی مضمون کے لیے ملاحظہ ہو: اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتبہ رؤف پاریکھ) (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۲۳ و بعدہٗ۔

۹۔ دیکھیے: کتابیاتِ لغاتِ اردو، بحولۂ بالا، ص ۳۳۔

۱۰۔ مہذب اللغات، جلد اول، ص ج۔

۱۱۔ اس کا ذکر سڈنی آئی لینڈو (Sydney I. Landau) نے اپنی کتاب Dictionaries: The Art and Craft of Lexicography میں کیا ہے، (نیویارک: چارلس اسکبنرس سنز، ۱۹۸۴ء)، بالخصوص باب پنجم۔

۱۲۔ بی ٹی سو اٹکنس (B.T.Sue Atkins) و دیگر، The Oxford Guide to Practical Lexicography (اوکسفرڈ، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۔۲؛ نیز سڈنی آئی لینڈو، محولہ بالا، ص ۳۲۔

۱۳۔ لیما سے متعلق تفصیلات کے لیے دیکھیے: بو سونسن (Bo Svensen)، A Handbook of Lexicography، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)، پانچواں باب۔

۱۴۔ دیکھیے: تنقیدی افکار (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۴ء) ص ۲۲۶۔

۱۵۔ مسعود صاحب ترتیبِ حروفِ تہجی کے ضمن میں یہ وضاحت اپنے ایک مقالے میں کی ہے، دیکھیے: مقالاتِ مسعود (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۸۸۔

۱۶۔ دیکھیے: لغاتِ روزمرہ (کراچی: آج، ۲۰۰۳ء) (اشاعتِ دوم)

۱۷۔ ملاحظہ ہو راقم کا مضمون: تلفظ، فرہنگِ تلفظ اور صوتیات، مشمولہ قومی زبان، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۸۸۔۷۱

۱۸۔ دیکھیے: مقدمہ، لغتِ کبیر (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۳ء) ص ۴۸۔۴۷

۱۹۔ اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۶۵، ۱۶۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

ماٰخذ:

۱۔ اٹکنس، بی ٹی سو (Atkins, B.T. Sue) و دیگر، The Oxford Guide to Practical Lexicography، اوکسفرڈ، ۲۰۰۸ء۔

۲۔ خان، مسعود حسین، مقالاتِ مسعود، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء۔

۳۔ پاریکھ، رؤف (مرتب)، اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء۔

۴۔ پاریکھ، رؤف، علم لغت، لغت نویسی اور لغات، کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء۔

۵۔ پاریکھ، رؤف، تلفظ، فرہنگ تلفظ اور صوتیات، مشمولہ ماہ نامہ قومی زبان، کراچی، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۸۸۔۷۱

۶۔رام، مالک، تذکرۂ ماہ و سال، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۱ء۔

۷۔سونسن، بو (Bo Svensen)، A Handbook of Lexicography ، کیمرج: کیمرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء۔

۸۔شاہجہاں پوری، ابوسلمان، کتابیاتِ لغاتِ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء۔

۹۔عبدالحق، مولوی، لغتِ کبیر، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۳ء۔

۱۰۔فاروقی، شمس الرحمٰن، تنقیدی افکار، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۰۴ء

۱۱۔فاروقی، شمس الرحمٰن، لغاتِ روزمرہ، کراچی: آج ۲۰۰۳ء، (اشاعتِ دوم)

۱۲۔فروغ، بشارت علی خاں وفیاتِ مشاہیرِ اردو، دہلی: ناشر مولف، ۲۰۰۰ء۔

۱۳۔لینڈو، سڈنی آئی (Landau, Sydney I.)، Dictionaries: The Art and Craft of Lexicography، نیویارک: چارلس اسکبنر س سنز، ۱۹۸۴ء۔

۱۴۔ہاشمی، مسعود، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۲ء۔

تحقیقِ الفاظ و اشتقاق اور ان کی اردو فرہنگیں

ایک عام تاثر یہ ہے کہ اردو میں بعض موضوعات پر کتابیں یا تو بالکل نہیں لکھی گئیں یا اردو میں ان موضوعات پر اتنی اور ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جتنی اور جیسی انگریزی میں ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر اشتقاقِ الفاظ (etymology) اور لفظوں کی تاریخ (word hisotries) کے موضوع پر اردو میں کتابوں کی عدم دست یابی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو میں الفاظ کی تاریخ اور اشتقاقیات پر بھی خاصی کتابیں لکھی گئی ہیں، اگرچہ اتنی تو نہیں جتنی انگریزی میں لیکن اردو بھی اس معاملے میں تہی دست نہیں ہے۔ اس مقالے میں ہم اردو میں الفاظ کے اشتقاق اور ان کی اصلیت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں رلغات کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ اردو میں اس موضوع پر کب سے کام شروع ہوا اور کس کس نے کیا لکھا۔ اردو میں موجود اشتقاقیات کی کتب رلغات پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ اشتقاقیات سے کیا مراد ہے۔

☆علمِ اشتقاق یا اشتقاقیات (etymology)

علمِ اشتقاق یا اشتقاقیات کو انگریزی میں ایٹمولجی (etymology) کہتے ہیں۔ یہ علم دراصل الفاظ کی تاریخ کی تحقیق ہے[1]۔ یہ علم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کسی لفظ نے ماضی میں ارتقا کے سفر کے مختلف مراحل میں کیا کیا شکلیں اختیار کیں، تاریخ کے مختلف ادوار میں اس لفظ کے بدلتے مفاہیم کیا تھے اور ایک زبان سے دوسری زبان میں اس لفظ نے کس طرح اور کس شکل و معنی کے ساتھ سفر کیا[2]۔

البتہ لفظ etymology کے معنی علمِ اشتقاق یا اشتقاقیات کے علاوہ بھی ہیں اور وہ معنی

ہیں کسی لفظ کی تاریخ۔ جب ہم کہتے ہیں ''فلاں لفظ کا اشتقاق'' تو اس کا مطلب ہے اس ایک لفظ کی تاریخ ۳۔ گویا اشتقاق کے مفہوم میں لفظ کی اصل کے ساتھ اس کی تاریخ بھی شامل ہے کیونکہ بعض اوقات کسی لفظ کی تاریخ ہی سے اس کی اصل کا سراغ ملتا ہے۔

لفظ etymology کے استعمال کو دیکھا جائے تو انگریزی میں اس کے مختلف مفہوم مختلف زمانوں میں رائج رہے ہیں اور لوگ مختلف حالات میں اس کا مفہوم اپنے تناظر میں لیتے رہے ہیں، مثلاً ایک زمانے میں مشرقی یورپ اور خاص طور پر بازنطینی اہل علم کے ہاں etymology سے وہ مفہوم مراد لیا جانے لگا جو اب ہم صَرف (morphology) اور لفظوں کی تصریف (inflection) یا گردان (conjugation) سے لیتے ہیں، اگرچہ اس لفظ کے استعمال میں ''اصل معنی'' کا مفہوم ہمیشہ شامل رہا ہے ۴۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی بھی لفظ کا مفہوم ماضی کے اثرات سے مکمل طور پر آزاد اور جدا ہوسکتا ہے اور ایک لفظ کا مفہوم کسی رمز یا ایمائیت کا حامل بھی ہو جاتا ہے ۵۔ جس طرح کسی بصری علامت (مثلاً عیسائیت کے لیے صلیب، اسلام کے لیے ہلال اور اشتراکیت کے لیے درانتی اور ہتھوڑا) کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے اور وہ علامت اس ظاہری شے کی بجائے کسی اور شے کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے اسی طرح کسی لفظ میں بھی کوئی ایسے گہرے معنی چھپے ہوئے ہو سکتے ہیں جو کسی خاص تناظر میں کچھ اور ہی پیغام دے رہے ہوں ۶۔ ایسے لفظوں کے چھپے ہوئے معنوں کا علم ان لفظوں کی تاریخ سے ہوسکتا ہے۔

مختلف علوم بالخصوص تاریخ کے مطالعے میں لسانی تحقیق کے عنصر کے آنے سے یہ ہوا کہ کسی لفظ کے اشتقاق یا اصل (etymology) کا مفہوم لفظ کے ''پچھلے یا پرانے معنی'' یا ''پچھلے مصدقہ معنی'' ہوگیا بلکہ اس لفظ (یعنی etymology یا اشتقاق) کو ایک اور معنی میں بھی برتا جانے لگا ہے اور وہ معنی ہیں: ''قدیم معنی جن کی تشکیلِ نو ہوسکتی ہو'' ۷۔ اس طرح جدید علمِ اشتقاقیات کی حیثیت ایک ایسے علم کی ہوگئی جو لفظوں اور ناموں کے بارے میں تاریخی معلومات کے ریزے ریزے جوڑ کر ان کی اصل کی شناخت کرتا ہے اور ان کو ان کے پرانے اور پراسرار مفاہیم سے الگ کر کے ان کے اصلی اور قدیم ترین معنی تک پہنچتا ہے ۸۔ چنانچہ اب کسی

کو اپنے اشتقاقی تجسس کی تسکین کرنی ہوتی ہے تو وہ اشتقاقی لغت (etymological dictionary) سے رجوع کرتا ہے جو اسے بتاتی ہے کہ کوئی لفظ پہلے کیا شکل رکھتا تھا (یعنی اس کا املا یا تلفظ وغیرہ کیا تھے)، اس کا کیا مفہوم تھا اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اس نے کیا کیا روپ بدلے، اور اس کے موجودہ معنی سے قبل یہ کون کون سے مفاہیم کا حامل رہا ہے۹۔ اس ضمن میں یہ دریافتیں بھی ہوئی ہیں کہ کون کون سے لفظ ایک زبان سے ہجرت کر کے دوسری زبانوں میں گئے اور یہ بھی کہ کچھ لفظ مسلسل ہجرت میں ہیں اور اسی لیے انھیں ''ہجرتی لفظ'' (migratory word) کا نام دیا گیا ہے، مثلاً اناطولی لبرمین (Anatoly Liberman) نے اپنی کتاب Word Origins...And How We Know Them: Etymology for Everyone میں اسے ہجرتی الفاظ (migratory words) کہا ہے جو ہجرتی پرندے (migratory birds) کے انداز پر ہے اور خوب ہے۱۰۔

اسی طرح یہ تحقیق بھی ہوئی ہے کہ اشیاء (بالخصوص اشیائے تجارت) اور بعض تصورات کو دیے گئے نام کن برادریوں اور گروہوں کے زیر استعمال چلتے چلے آرہے ہیں اور یہ لفظ یا نام کس طرح ان لوگوں اور برادریوں کی نشان دہی کرتے ہیں جن سے یہ نام منسوب ہیں۱۱۔

گیان چند نے etymology کو ''لفظ اصلیات'' کہا ہے۱۲۔ گیان چند کے بقول etymos یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں سچا، جبکہ logy یا logos لفظ کو کہتے ہیں چنانچہ etymology کے معنی ہوئے لفظ کی سچائی۱۳۔ لیکن یونان اور روم میں etymology کے معنی ''کسی لفظ کے ابتدائی اور اصلی معنی تلاش کرنا'' کے تھے اور بعد میں اس کے معنی ''لفظوں کی اصل دریافت کرنا'' کے ہو گئے۔ کسی لفظ کی اصلیت معلوم کرنا دراصل اس لفظ کی تاریخ معلوم کرنا ہے۱۴۔ پی ایچ میتھیوز کے مطابق جب یہ کہا جاتا ہے کہ اشتقاقیات (etymology) لفظوں کی اصلیت کے مطالعے کا نام ہے تو اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس علم کا بس یہی کام ہے کہ وہ لفظوں کی اصل بتائے جبکہ درحقیقت اشتقاقیات کسی لفظ کی ان تاریخی اور قدیم شکلوں کے مطالعے کا نام ہے جس سے اس کا ارتقا ہوا ہے یا ممکنہ طور پر ہوا ہوگا۱۵۔

گویا اشتقاقیات کے دائرے میں کسی لفظ کی اصل کے علاوہ اس کی تاریخ بھی آجاتی ہے،

یعنی کسی لفظ کی اصلیت اوراس کی ماخذ زبان کے علاوہ یہ مطالعہ کہ کسی لفظ نے کسی ایک زبان سے نکل کردوسری زبان میں جاکرکون کون سی شکلیں بدلیں اورمعنوی، املائی اورصوتی لحاظ سے اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۱۶۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علم اشتقاق دراصل تاریخی لسانیات (historical linguistics) کے ذیل میں آجاتا ہے۱۷۔

☆اشتقاقی مطالعات: ایک مختصر تاریخ

قدیم روم کے لوگ ان یونانی الفاظ سے واقف تھے جوان کی عام بول چال کی لاطینی میں جذب ہوگئے تھے نیز دنیا میں سفر کے ذرائع کے بڑھنے اوردوسری زبانوں کے علم کے حصول نے بھی اس شعورکواجاگرکیا کہ کسی بھی زبان میں رائج کئی الفاظ نہ صرف یہ کہ مختلف زمانوں سے گزرکر آئے ہیں بلکہ ان میں سے کئی اصلاً متعدد زبانوں سے مستعار لیے ہوئے ہیں۱۸۔

لیکن مغرب میں اشتقاقی مطالعات کی تاریخ دیکھی جائے تو سب سے پہلے جونام سامنے آتا ہے وہ ایزیدور (Isidore) کا ہے جو Isidore of Seville یعنی ''اشبیلیہ کا ایزیدور'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ وہ اشبیلیہ کا اُسقفِ اعظم (archbishop) تھا۔ مغربی دنیا کا یہ عالم (متوفی ۶۳۶ عیسوی) نہ صرف اپنے اس کام کے لیے معروف ہے جودائرۂ معارف یعنی انسائیکلوپیڈیا کی نوعیت کا تھا بلکہ اس کام کے لیے بھی جواس نے قدیم لفظوں بالخصوص لاطینی الفاظ کے اشتقاق کے ضمن میں کیا تھا۱۹۔ اشتقاقیات کے سلسلے میں اس کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں الفانسو دہم (Alfanso X) ، جوقسطیلیہ (Castile)اور لیون (Leon) کا حاکم تھا، نے اپنے دربار کے علما کو دیگر علمی کاموں کے علاوہ اس امر کی بھی ذمے داری دی کہ وہ الفاظ اور ناموں کا درست مفہوم معلوم کریں۲۰۔ لیکن یورپ میں صحیح معنوں میں اشتقاقیات اورلفظوں کی اصل کاعلم ۱۵۰۰ءاور۱۸۰۰ء کے درمیان پروان چڑھا ۲۱۔

انیسویں صدی میں عصریاتی فونیمیات (diachronic phonology) کے فروغ پانے سے بھی اشتقاقی مطالعات کوفروغ ملا۔ فرانز بوپ (Franz Bopp) (متوفی ۱۸۶۷ء)، جسے بابائے ہندیورپی تقابلی لسانیات کہا جاتا ہے، نے اگرچہ زیادہ زورقواعداورقواعدی خصوصیات پردیا لیکن ضمنی طور پراس نے اشتقاقیات پر بھی کام کیا ۲۲۔ اس کے بعد تو اشتقاقیات

پر کام کرنے والے مغربی ماہرین کی ایک طویل فہرست ہے جس کا ذکر یہاں ممکن بھی ہو تو ضروری نہیں ہے۔

☆اردو میں اشتقاقیات پر ابتدائی کام

اردو میں لکھی گئی باقاعدہ اشتقاقی لغات کے ذکر سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس موضوع پر پہلے پہل کیا لکھا گیا۔ اگر چہ اس موضوع پر ہمارے ہاں سب سے پہلے سراج الدین علی خاں آرزو نے لکھا اور توافق اللسان پر ان کا کام ''مثمر'' کے نام سے ہے لیکن وہ کام فارسی میں ہے۔ اردو میں اشتقاقیات کے موضوع پر سب سے پہلے لکھنے والے محمد حسین آزاد تھے جنھوں نے اپنی کتابوں بالخصوص آب حیات اور سخن دانِ فارس میں الفاظ کے اشتقاق سے بحث کی ۲۳۔ اس کے بعد سید احمد دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ میں کئی الفاظ کے معنی لکھتے ہوئے ان کے اشتقاق اور اصل پر روشنی ڈالی۔ وحید الدین سلیم نے اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں دیگر مباحث کے ساتھ اشتقاق کے موضوع پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے ۲۴۔ عبدالستار صدیقی نے اپنے مقالات میں بعض الفاظ کے اشتقاق اور جغرافیائی مقامات کی اصل پر نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے ۲۵۔ عبدالرشید ٹھٹھوی (مولف فرہنگِ رشیدی) کی کتاب معربات رشیدی میں ان الفاظ پر بحث کی گئی ہے جو غیر زبانوں بالخصوص فارسی کے ہیں لیکن عربی میں دخیل ہیں۔ اگر چہ یہ ایک پرانا کام تھا جو فارسی میں ہوا تھا لیکن عبدالستار صدیقی نے اسے مرتب کر دیا تھا۔ یہ طبع (print) تو ہو گیا تھا لیکن شائع (publish) نہ ہو سکا تھا۔ اسے مظہر محمود شیرانی نے مع اردو ترجمے کے مرتب کر دیا ۲۶۔ یہ ایک اہم اور مفید کام ہے۔

پھر سید سلیمان ندوی نے اپنی بعض کتابوں خاص طور پر نقوش سلیمانی میں اس موضوع پر قابل قدر کام کیا ۲۷۔ محمد بن عمر کی کتاب ''اردو میں یورپی زبانوں کے الفاظ'' میں بڑی تعداد میں اردو میں مستعمل ان الفاظ کی اصل بتائی گئی ہے جو انگریزی، فرانسیسی اور دیگر یورپی زبانوں سے اردو میں آئے ہیں ۲۸۔ بعد ازاں شوکت سبزواری نے اردو نامہ میں اشتقاقیات کے عنوان سے کئی مضامین لکھے جن میں الفاظ سے بحث کرتے ہوئے ان کی اصل اور تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے ۲۹۔

لیکن ان میں سے کسی کو بھی اشتقاقیات کی فرہنگ کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ

ان کتب میں الفاظ سے متعلق بہت اہم، دل چسپ اور قابل قدر معلومات مل جاتی ہیں جن کی مدد سے اردو میں اشتقاقیات یا الفاظ کی اصل اور ان کی تاریخ پر کتاب بلکہ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

☆الفاظ کے اشتقاق اور تحقیق کی فرہنگیں، اردو میں

اب ہم اردو میں الفاظ کے اشتقاق اور ان کی اصل کی وضاحت کرنے والی فرہنگوں کا احوال معلوم کرتے ہیں۔

ا۔المفرد والمرکب (۱۶۔۱۹۱۷ء)

یہ اردو میں اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔اسے مولوی عبداللطیف نے مرتب کیا اور یہ پہلی بار حیدرآباد (جو پہلے دکن کا حصہ تھا اور اب ہندوستان کی ریاست آندھرا پردیش میں شامل ہے) سے شائع ہوئی۔لوح پر ''مطبوعہ ذخیرہ پریس، حیدرآباد دکن'' درج ہے لیکن ناشر کا نام اور سال اشاعت درج نہیں۔مولف کے نام کے ساتھ ''از دودمانِ مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات'' تحریر ہے۔آخر میں قطعۂ تاریخ تالیف ہے جس سے ۱۳۳۵ ہجری کا سال نکلتا ہے۔عیسوی حساب سے اس کی تطبیق ۱۷۔۱۹۱۶ء سے ہوتی ہے۔

اس کتاب میں ایسے الفاظ کے مآخذ، الفاظ کی اصل اور اجزاے ترکیبی بتائے گئے ہیں جو دراصل مرکب ہیں اور دو الفاظ سے مل کر بنے ہیں لیکن صدیوں کے استعمال سے مل کر ایک ہو گئے ہیں اور اب ان کو مفرد سمجھا جاتا ہے۔اس کی جو دل چسپ مثالیں کتاب میں دی گئی ہیں ان میں ''بیدار'' اور ''بیزار'' بھی شامل ہیں۔آج کل الفاظ کو غیر ضروری طور پر توڑ کر لکھنے کی بدعت زور پکڑ رہی ہے اس کی لپیٹ میں لفظ بیدار اور لفظ بیزار بھی آ گئے ہیں اور ان کو بے جا طور پر ''بے دار'' اور ''بے زار'' لکھا جا رہا ہے۔لیکن اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہ الفاظ ہیں جن میں فارسی کا لاحقۂ فاعلی و نسبت ''آر'' موجود ہے۔بقول مولف:

> ''بیدار (جو سویا ہوا نہو[کذا: نہ ہو])، مرکب ہے، بید بہ معنی شعور و آگہی اور آر کلمہ نسبت ہے یعنی ہوشیار''۳۰۔

اسی طرح بیزار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بیزار مرکب ہے، بیز قدیم فارسی میں سیری جس کے معنی دل بھر جانا ہیں اور آر

کلمہ فاعل ہے''[۳۱]۔

گویا الفاظ توڑ کر لکھنے کے غیر ضروری فیشن میں مبتلا حضرات اگر بیدار اور بیزار کو توڑ کر لکھنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں ''بید آر'' اور ''بیز آر'' لکھیں۔ اگر چہ یہ بھی بالکل غلط ہوگا اور تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے کی کوشش ہوگی۔ اب فارسی میں بھی ان الفاظ اس طرح نہیں لکھا جاتا۔ یہ الفاظ دو کلمات کے ادغام وانضمام سے بالکل ایک ہو چکے ہیں لیکن بغیر سوچے سمجھے ہر اردو لفظ کو عربی فارسی کے پیچھے چلانے کے شائق حضرات جو لفظوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلے رہتے ہیں ان الفاظ کو ''بے زار'' اور ''بے دار'' لکھ کر ہمیں بیزار کرتے رہیں گے حالانکہ اس طرح ''بے'' ایک سابقے کا کام کرتا ہے۔ عرض ہے کہ ان لفظوں کو توڑ کر یعنی انھیں بے دار اور بے زار لکھنے سے یہ الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا صحیح املا بیدار اور بیزار ہے (یعنی ملا کر)۔ بے دار اور بے زار (یعنی توڑ کر) وہ نام نہاد الفاظ ہیں جو اردو تو کیا فارسی میں بھی وجود نہیں رکھتے۔

انگریزی میں تو پہلے یہ رجحان تھا کہ دو الفاظ کو الگ الگ لکھ کر یا درمیان میں چھوٹی سی لکیر (جس کو ہائفن hyphen کہتے ہیں) لگا کر مرکبات لکھے جاتے تھے لیکن اب جدید دور میں کئی انگریزی الفاظ کو ملا کر ایک لفظ کی طرح لکھا جا رہا ہے، کیونکہ یہ الفاظ اب یک جان ہو کر ایک لفظ بن چکے ہیں۔ لیکن ہم اردو والے ہمیشہ سے تاریخ کا پہیہ الٹا گھمانے کے شوقین رہے ہیں سو اسی طرح گھماتے رہیں گے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایسے بہت سے مغالطے دور ہو جاتے ہیں جو الفاظ کو خواہ مخواہ توڑنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔

۲۔ سرگزشتِ الفاظ (۱۹۲۳ء)

رچرڈ ٹرنچ (Richard Chenevix Trench) (۱۸۸۶ء۔۱۸۰۷ء) ایک مشہور پادری اور عالم زباں تھا۔ وہ اوکسفرڈ کی مشہور کلاں انگریزی لغت کی اس مشاورتی کمیٹی میں بھی شامل تھا جو ستر (۷۰) برسوں کی محنت کے بعد شائع ہوئی تھی۔ ٹرنچ کی کتاب ''اسٹڈی اوف ورڈز'' (Study of Words) بہت مشہور ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے[۳۲]۔ یہ الفاظ اور ان کی اصل و ماخذ سے متعلق ہے۔

لاہور سے تعلق رکھنے والے معروف اہل قلم احمد دین (۱۹۲۹ء۔۱۸۶۶ء) نے جب ٹرنچ

کی یہ کتاب پڑھی تو بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اسی طرز پر اردو میں کتاب لکھنے کی ٹھانی جس میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو الفاظ کی اصل اوران کا اشتقاق بتایا جائے۔ چنانچہ انھوں سرگزشتِ الفاظ میں تقریباً ساڑھے چھ سو الفاظ کی اصل اوران کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کا لاہور سے پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں اور دوسرا ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اسلام آباد سے ایک نیا ایڈیشن مشینی کتابت کے ساتھ شائع ہوا۔

۳۔ تحقیق اللغات (۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (متوفی ۱۹۷۷ء) گورنمنٹ کالج، لاہور، اور پنجاب یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ تھے۔ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھیں الفاظ کی اصل اور ان کی تاریخ و اشتقاق سے بہت دل چسپی تھی۔ ان کی ایک مختصر سی مگر نہایت وقیع کتاب ''تحقیق اللغات'' کے نام سے ہے۔

مختلف زبانوں کے اردو میں مستعمل الفاظ اور اعلام کی دل چسپ اور تحقیق پر مبنی تاریخ بیان کی ہے۔ ایک خاص بات مصنف کے قلم سے اس کا انگریزی دیباچہ اور انگریزی کتابیات کی فہرست ہے جس میں مختلف زبانوں کی سو (۱۰۰) سے زیادہ کتب کا حوالہ موجود ہے[۳۳]۔

۴۔ لفظوں کی انجمن میں (۱۹۹۶ء)

سید حامد حسین کی اس کتاب میں عنوان وار مختلف موضوعات پر الفاظ سے بحث کی گئی ہے۔ پہلی بار مکتبۂ جامعہ (دہلی) سے شائع ہوئی تھی۔ بعض امور میں کتاب مفید ہے لیکن مصنف کے بعض بیانات کی تصدیق کسی بھی علمی ماخذ سے نہیں ہوتی اور انھوں نے خود کسی کتاب کا حوالہ دینے کی زحمت نہیں فرمائی۔ بعض بیانات مختلف کتابوں سے بغیر حوالے کے نقل کر دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں علم الاصنام (mythology) کے معروف قصے بھی بلا کسی دلیل کے پیش کر دیے گئے ہیں[۳۴]۔ مصنف کا مذہبی تعصب بھی بعض مقامات پر جھلکتا ہے۔ غرض کتاب تحقیق طلب اور بحث طلب ہے[۳۵]۔

۵۔ پردہ اٹھادوں اگر۔۔۔ (۲۰۰۳ء)

کتاب کا پورا نام ''پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے'' ہے اور یہ اقبال کے ایک مصرعے

میں معمولی سی تبدیلی کا نتیجہ ہے(بال جبریل میں شامل نظم مسجد قرطبہ کے مصرعے میں لفظ ''افکار'' ہے جسے ''الفاظ'' سے بدلا گیا ہے)۔ کتاب کے مصنف ف۔رحیم کئی زبانوں کے الفاظ پر نظر رکھتے ہیں اور بعض الفاظ کی اصل کا سراغ دل چسپ انداز میں بیان کرنے میں کام یاب رہے ہیں۔ کتاب ہندوستان سے پہلی بار ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ لاہور سے بھی شائع ہوئی ۳۶۔ اس لحاظ سے بہت مفید اور اہم ہے کہ اس میں مختلف زمانوں میں الفاظ کی بدلتی شکلوں اور مختلف زبانوں میں ان کے دخیل و مستعار ہونے سے متعلق اہم اور دل چسپ معلومات دی گئی ہیں۔ یہ اردو میں اشتقاقیات کی عمدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔

۶۔ لفظوں کی کہانی لفظوں کی زبانی (۲۰۰۴ء)

یہ کتاب دراصل خالد احمد کی کتاب The Bridge of Words Between East and West کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ شیراز راز نے کیا ہے ۳۷۔ کتاب خالد احمد کے انگریزی کے ان کالموں کا مجموعہ ہے جو مختلف زبانوں کے الفاظ، ان کی اصل اور دوسری زبانوں تک ان کی ہجرت کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ البتہ جن الفاظ سے بحث کی گئی ہے ان میں سے زیادہ تر ہند یورپی (Indo-European) خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خالد احمد نے کوشش کی ہے ہند یورپی الفاظ کے اشتقاق اور اصلیت یا مادّوں کو مقامی (اردو، ہندی، پنجابی، پشتو وغیرہ) میں تلاش کیا جائے۔ بعض اوقات وہ محض ظاہری شباہت کو دیکھ کر اٹکل سے کام لیتے ہیں اور ان کے تیقّن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایسے الفاظ سے متعلق ان کے اخذ کردہ نتائج کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی حوالہ وہ نہیں دیتے اور محض قیاس سے کام لیتے ہیں۔ ایسے اشتقاق کو تاریخی لسانیات والے قیاسی اشتقاق (speculative etymology) کہتے ہیں ۳۸۔

البتہ خالد احمد بسا اوقات نہایت عالمانہ انداز میں لفظوں کی اصل دریافت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں اور اشتقاقیات کے موضوع پر انگریزی کی نادر کتابوں سے بہت کچھ اخذ کرتے ہیں۔ یہ اردو میں اشتقاقیات کے موضوع پر لکھی گئی ان چند کتابوں میں سے ہے جن میں تحقیقی اسلوب پایا جاتا ہے لیکن افسوس وہ

حوالے اس طرح نہیں دیتے جس طرح علمی کاموں میں دیے جاتے ہیں اور دینے چاہییں۔ اصل انگریزی کتاب اور اس کے اردو ترجمے کے عنوانات رمضامین میں خاصا تفاوت ہے، نجانے کیوں اور اس کی کوئی وضاحت بھی نہیں کی گئی۔

۷۔ سیاحتِ لفظی (۲۰۰۷ء)

ممتاز ذاہر کی اس کتاب ۳۹ میں مختلف زبانوں کے اردو میں مستعمل الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے لیکن سابقوں اور لاحقوں کی طویل فہرستیں بھی دے دی ہیں حالانکہ ان کی ضرورت ویسے بھی نہیں تھی اور وحید الدین سلیم کی کتاب ''وضعِ اصطلاحات'' میں یہ سب موجود ہیں۔ سلیم کی اس کتاب کا بھی حوالہ نہیں دیا بلکہ حوالہ کسی کتاب کا نہیں دیا، صرف چند لغات کا نام آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض اندراجات دل چسپ اور اہم ہیں لیکن حوالوں کی عدم موجودگی اور غیر ضروری اندراجات نے کتاب کا تاثر کم کر دیا ہے۔

۸۔ لفظوں کا دل چسپ سفر (۲۰۰۷ء)

ایس اے ہاشمی کی اس کتاب میں ایسے الفاظ کی تاریخ اور استعمال بیان کیا گیا ہے جو کسی ایک علاقے یا زبان سے سفر کرتے ہوئے کہیں اور پہنچے اور دوسرے علاقوں کے رہنے والوں نے اپنی زبان کے لحاظ سے ان کے تلفظ یا مفہوم میں تبدیلیاں کر دیں۔ ایسے کئی الفاظ کا اس کتاب میں ذکر ہے جو فارسی سے عربی میں گئے اور ان میں کچھ املائی رصوتیاتی تبدیلیاں ہوگئیں۔ کتاب دل چسپ ہے لیکن کسی بھی قسم کے حوالے یا سند سے عاری ہے[۴۰]۔

۹۔ ہیں کواکب کچھ (۲۰۰۷ء)

حسین امیر فرہاد نے اپنے عربی کے علم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مختصر کتاب میں عربی کے متعدد الفاظ کی تشریح و اشتقاق بیان کیا ہے[۴۱]۔ لیکن افسوس کہ وہ اس مسلمہ اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جو لفظ اردو میں آ گیا اب وہ اردو کا ہے اور اب اس کا مفہوم، استعمال اور محاورات و مرکبات سب اردو کے لحاظ سے ہوں گے چاہے اصل زبان (مثلاً عربی یا فارسی) کے لحاظ سے وہ استعمال غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ اردو میں بلا مبالغہ ایسے ہزاروں الفاظ ہیں جن کا تلفظ یا مفہوم یا دونوں بدل چکے ہیں لیکن انشاء اللہ خاں انشاء، مولوی عبدالحق، عبدالستار صدیقی اور سید سلیمان

ندوی جیسے اہلِ علم نے اس بات کی تائید کی کہ ایسے الفاظ کے تلفظ اور مفہوم کے لیے اردو میں رائج استعمال ہی درست اور سند ہوگا۔

مولف حسین امیر فرہاد ابتدا ہی میں لکھتے ہیں کہ" 'جلوس جارہا تھا' صریحاً غلط ہے کیونکہ [عربی میں] جلوس بیٹھنے کو کہتے ہیں"۔ عرض ہے کہ ایسے الفاظ اردو میں ہزاروں ہیں جن کا تلفظ اور مفہوم اصل زبان (مثلاً عربی یا فارسی) سے بہت مختلف ہے لیکن وہ "صریحاً غلط" اس لیے نہیں ہیں کہ وہ اردو میں استعمال ہورہے ہیں نا کہ اصل زبان میں۔ لہٰذا وہ اب درست اور فصیح ہیں۔ ہاں جب ہم انھیں عربی یا فارسی میں استعمال کریں گے تو ان زبانوں کے استعمال کو ملحوظ رکھیں گے، البتہ فی الحال تو اردو میں استعمال کررہے ہیں اس لیے اردو کے لحاظ سے وہ بالکل درست ہیں اور "جلوس جارہا تھا" بھی سو فی صد درست ہے۔ فرانسیسی کے ہزاروں الفاظ انگریزی میں مستعمل ہیں اور ان میں سے کئی کا تلفظ اور مفہوم اب انگریزی میں وہ نہیں رہا جو فرانسیسی میں ہے۔ کیا وہ بھی "صریحاً غلط" ہیں؟

اگر ہمیں ہر لفظ کے لیے عربی کی طرف دیکھنا ہے تو پھر عربی ہی کیوں نہ بولیں۔ پھر اردو کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اردو اب ایک خود مختار زبان ہے اور عربی فارسی کے قواعد کا اس پر اطلاق نہیں ہوسکتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح انگریزی میں لاطینی، یونانی اور فرانسیسی زبانوں کے قواعد اور ان کے انگریزی میں دخیل الفاظ کی اصل اور اشتقاق کو نظر انداز کر کے انگریزی کے لحاظ سے ان کا تلفظ اور استعمال روا رکھا گیا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی ان الفاظ کو "اگر ہم ان کی اصلی شکلوں میں لکھنے اور بولنے لگیں تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی"[۴۲]۔

بہر حال کتاب مفید ہے اور اس طرح کے مباحث سے قطع نظر بعض الفاظ کے اشتقاق سے متعلق گفتگو اہم ہے۔

۱۰۔ اشتقاقی لغت (۲۰۰۵ء)

سہیل بخاری کی کتاب "اشتقاقی لغت" انجمن ترقیٔ اردو کے رسالے "اردو" میں شائع ہوئی اور الگ کتابی صورت میں اشاعت کا کام بوجوہ ٹل گیا۔ آخر جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے رسالے "جریدہ" میں نظر ثانی شدہ صورت میں چھپی[۴۳] (یہ پورا شمارہ اسی کتاب پر مبنی

ہے)۔

سہیل بخاری لسانیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کا ایک خاص نظریہ صوتی تبادل اور آوازوں کی تقلیب رسقوط کا تھا جس پر انھوں نے اپنی کتاب تشریحی لسانیات میں تفصیل سے بات کی ہے[۴۴]۔

لیکن سہیل بخاری نے اپنی کئی تحریروں میں ہندی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ غیر ضروری طور پر ٹھونس کر استعمال کیے ہیں جو اردو میں شاذ و نادر استعمال ہوئے ہیں اور بعض تو بہت ہی نامانوس اور غریب معلوم ہوتے ہیں جس سے اچھی خاصی کتابوں کا بھی ستیاناس ہو گیا ہے کیونکہ ان کے خاصے حصے عام قاری کیا اردو کے ہم جیسے طالب علموں کے لیے بھی ناقابلِ فہم ہو گئے ہیں۔ مثلاً وہ مصوتوں اور مصمتوں کو "سر" اور "اسر" لکھتے ہیں جبکہ اردو میں واول اور کونسوننٹ تو پھر بھی قابلِ فہم ہیں لیکن ان اصطلاحات سے الجھن ہوتی ہے۔ ان کی اس طرح کی اصطلاحات اور سنسکرت آمیز اردو لکھنے کا شوق قاری کی راہ میں روڑے بلکہ پہاڑ کھڑے کر دیتا ہے۔

افسوس کہ اتنا اہم اور وقیع علمی ذخیرہ بخاری صاحب کی علمی بوقلمونی کے اس شوق کی نذر ہو گیا۔ لیکن اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل بخاری صاحب کی جیسی نظر خالصتاً مقامی (سنسکرت رپراکرت رہندی راردو) الفاظ پر تھی اور جس طرح انھوں نے اس کتاب میں ان الفاظ کے معنی اور ان کا اشتقاق بیان کیا ہے وہ اردو میں کم از کم دورِ حاضر میں بلکہ پچھلے دور میں بھی نایاب نہیں تو کم یاب ضرور تھا۔ اگر وہ عام فہم اردو میں یا مروج زبان میں لسانیات کی کتابیں (اور اِس کتاب کا مقدمہ بھی) لکھ دیتے تو ان کی بات کا ابلاغ بھی ہو جاتا اور بہتوں کا بھلا بھی ہوتا۔

اس کتاب میں بخاری صاحب نے بتایا ہے کہ سنسکرت کے قواعد نویسوں نے الفاظ کی تین قسمیں بتائی ہیں، ایک تت سم یعنی وہ الفاظ جو سنسکرت میں بھی اسی روپ میں ملتے ہیں (یعنی اسی شکل میں جس میں وہ پراکرت یا اردو یا ہندی وغیرہ میں آگئے ہیں)، دوسرے تدبھو یعنی وہ الفاظ جو سنسکرت میں کچھ اور شکل میں تھے اور پراکرت یا اردو یا ہندی میں بدلی ہوئی حالت میں ملتے ہیں اور تیسرے دیسی یعنی پراکرت کے الفاظ جو سنسکرت میں وجود نہیں رکھتے اور اردو یا دوسری زبانوں میں موجود ہیں[۴۵]۔

لیکن خود انھوں نے اردو الفاظ کی چار قسمیں بتائی ہیں: ایک، دیسی یعنی وہ الفاظ جو صرف اردو میں ہیں اور اردو کے سوا کسی اور مقامی زبان یا بولی میں ان کا چلن نہیں، جیسے بھڑ بھونجا (یعنی بھٹی یا بھاڑ میں اناج بھونے وا'' یا بھاڑ جھونکنے والا نیز بے حیثیت)۔ دو، بدیسی یا دخیل یعنی وہ الفاظ جو دوسری زبانوں (فارسی یا عربی یا انگریزی وغیرہ) سے اردو میں آ گئے، جیسے خوش (فارسی)، مطلوب (عربی) اور اسٹیشن (انگریزی) وغیرہ۔ تین، مورد یعنی وہ الفاظ جنھیں اردو والوں نے اپنے لہجے کے مطابق ڈھال لیا ہے جیسے فیر (فائر)۔ چار، دخیل نما یعنی وہ دیسی الفاظ جن میں اردو والوں نے عربی فارسی کی آوازیں (ق، خ وغیرہ) رکھ کر ان کی شکل بدل دی ہے، جیسے خرانٹ ۔[۴۶]

اس عالمانہ مقدمے کے بعد لغت ہے جن میں اردو الفاظ کا تلفظ، اشتقاق اور معنی دیے گئے ہیں۔ بعض الفاظ کے ایک سے زیادہ معنی بھی درج ہیں۔ اردو کے قواعد نویسوں، لغت نویسوں اور اردو لسانیات پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ یہ تفہیم کی نئی راہیں کھولتی ہے۔

ان کتابوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو میں اشتقاقیات کی فرہنگیں موجود ہیں۔ اشتقاقیات کی تعریف پر یہ سب مکمل طور پر تو پوری نہیں اترتیں لیکن بہر حال ان میں الفاظ کی تاریخ، ان کے ارتقا، ان کی بدلتی شکلوں، بدلتے مفاہیم اور شکل بدلتے املا و تلفظ سے متعلق اہم اور بنیادی مباحث ضرور مل جاتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ فلپ ڈرکن، (Philip Durkin)، The Oxford Guide to Etymology،
(نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۔۱

۳۔ ایضاً۔

۴۔ یاکوو مل کیل، (Yakov Malkiel)، Etymology، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،

۱۹۹۳ء)،ص۴-۱

۵۔ایضاً،ص۱۔

۶۔ایضاً،ص۲-۱

۷۔ایضاً۔

۸۔ایضاً۔

۹۔ایضاً۔

۱۰۔(نیویارک:اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،۲۰۰۹ء)،ص۱۳۳۔

۱۱۔یاکوول کیل، (Yakov Malkiel) ، Etymology، محولۂ بالا، ص۳-۲

۱۲۔گیان چند جین،عام لسانیات(دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۵ء)،ص۵۶۱۔

۱۳۔ایضاً۔

۱۴۔ایضاً۔

۱۵۔پی،ایچ میتھیوز،(P.H.Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، (نیویارک:اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،۱۹۹۷ء)،ص۱۱۹۔

۱۶۔فلپ ڈرکن،محولۂ بالا،ص۳۔

۱۷۔ایضاً،ص۲۔

۱۸۔یاکوول کیل، (Yakov Malkiel) ، محولۂ بالا،ص۳-۲

۱۹۔ایضاً،ص۳-۲

۲۰۔ایضاً۔

۲۱۔ایضاً،ص۴۔

۲۲۔ایضاً،ص۹۔

۲۳۔تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:رؤف پاریکھ،محمد حسین آزاداور تحقیق لغات،مشمولہ آزادصدی مقالات(مرتبہ تحسین فراقی وناصر عباس نیر)،(لاہور:شعبۂ اردو،پنجاب یونی ورسٹی،۲۰۱۰ء)،ص۲۶۷-۲۶۰

۲۴۔وضع اصطلاحات کا نیا ایڈیشن کراچی سے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۲۰۱۷ء شائع کیا ہے۔

۲۵۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مقالات کی پہلی جلد لکھنؤ سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی تھی اب اس کا نیا ایڈیشن نیز جلد دوم بھی مجلس ترقی ادب (لاہور) نے شائع کردی ہے۔

۲۶۔دیکھیے: معربات رشیدی (مرتبہ عبدالستار صدیقی، مدوّنہ مظہر محمود شیرانی)، (کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء)۔

۲۷۔سید سلیمان ندوی جن لفظوں کی اصل پر بحث کی ہے انھیں سید حامد حسین نے اپنے ایک مقالے بعنوان علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیقات الفاظ اردو میں جمع کیا ہے۔دیکھیے: خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، شمارہ ۹۶، ص ۱۲۰۔۵؛ نیز عبیداللہ کوثی ندوی کا مقالہ مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی میں اردو زبان میں مستعمل الفاظ کی تحقیق، مشمولہ سید سلیمان ندوی (مرتبہ خلیق انجم)، (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۰۱۔۱۶۹۔

۲۸۔محمد بن عمر، اردو میں دخیل یورپی الفاظ (حیدرآباد دکن: مطبع ابراہیمیہ، ۱۹۵۵ء)۔

۲۹۔تفصیلات کے لیے دیکھیے: شوکت سبزواری، اشتقاقیات، (سہ ماہی) اردو نامہ (کراچی. ترقی اردو بورڈ)، شمارہ ۱۱تا۱۸، نیز شمارہ ۲۱تا۲۶؛ شمارہ ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۴۳۔

۳۰۔عبداللطیف، المفرد والمرکب (حیدرآباد (دکن)، ذخیرہ پریس، ۱۷۔۱۹۱۶ء، ص ۲۳۔

۳۱۔ایضاً۔

۳۲۔رچرڈ ٹرینچ کی اس کتاب کا پورا نام On the Study of Words ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔مرحوم مشفق خواجہ صاحب کے کتب خانے میں اس کی عکسی نقل موجود تھی جو ان کی عنایت سے راقم کی نظر سے گزری اور اس عکسی نقل کی عکسی نقل بھی موجود ہے۔یہ اس کا انیسواں ایڈیشن تھا جو لندن سے کیگن پال ٹرینچ ٹربنر اینڈ کمپنی نے ۱۹۱۴ء میں شائع کیا تھا۔

۳۳۔ملاحظہ ہو: شیخ عنایت اللہ، تحقیق اللغات (لاہور: ناشر ندارد، ۱۹۶۳ء)۔

۳۴۔رؤف پاریکھ، عصری ادب اور سماجی رجحانات (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء)، ص ۵۰۔۴۷

۳۵۔دیکھیے: سید حامد حسین، لفظوں کی انجمن میں (دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۹۶ء) [پہلا ایڈیشن]۔

۳۶۔ق۔عبدالرحیم، پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۳ء)۔

۳۷۔(لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۴ء)۔

۳۸۔مثلاً: اناطولی لبرمین (Anatoly Liberman) نے اپنی کتاب

Word Origins...And How We Know Them : Etymology for Everyone میں بعض الفاظ کے اشتقاق کا ذکر کرتے ہوئے یہ اصطلاح استعمال کی ہے، (نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)،ص ۱۴۷۔

۳۹۔(ملیسی: شرجیل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)۔

۴۰۔(کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۷ء)۔

۴۱۔حسین امیر فرہاد، ہیں کواکب کچھ (کراچی: ناشر و سن ندارد)۔

۴۲۔نقوش سلیمانی (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء)، ص ۳۲۱[دوسرا پاکستانی ایڈیشن]۔

۴۳۔شمارہ ۳۱، ۲۰۰۵ء۔

۴۴۔(کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۸ء)۔

۴۵۔جریدہ، شمارہ ۳۱، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۔

۴۶۔ایضاً۔

ماخذ:

۱۔بخاری، سہیل، اشتقاقی لغت، مشمولہ جریدہ (کراچی)، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۳۱، ۲۰۰۵ء۔

۲۔بخاری، سہیل، تشریحی لسانیات، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۸ء۔

۳۔ٹرینچ، رچرڈ (Trench, Richard Chenevix)، On the Study of Words، لندن: کیگن پال ٹرینچ ٹربنر اینڈ کمپنی، ۱۹۱۴ء[انیسواں ایڈیشن]۔

۴۔ٹھٹھوی، رشید، معربات رشیدی (مرتبہ عبدالستار صدیقی، مدونہ مظہر محمود شیرانی)، (کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۰۳ء)۔

۵۔جین، گیان چند، عام لسانیات، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء۔

۶۔حسین، سید حامد، علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیقاتِ الفاظِ اردو، مشمولہ، خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ)، شمارہ ۹۶، ص ۱۲۰۔۵

۷۔ حسین، سید حامد، لفظوں کی انجمن میں، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۶ء

۸۔ ڈاہر، ممتاز، سیاحتِ لفظی، میلسی: شرجیل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

۹۔ ڈرکن، فلپ ، (Durkin, Philip)، The Oxford Guide to Etymology، نیو یارک: اوکسفر ڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء۔

۱۰۔ پاریکھ، رؤف، عصری ادب اور سماجی رجحانات (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء)۔

۱۱۔ پاریکھ، رؤف، محمد حسین آزاد اور تحقیق لغات، مشمولہ آزاد صدی مقالات (مرتبہ تحسین فراقی و ناصر عباس نیر)، (لاہور: شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۶۷۔۲۶۰

۱۲۔ راز، شیراز (مترجم)، لفظوں کی کہانی لفظوں کی زبانی (مصنفہ خالد احمد)، لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۴ء۔

۱۳۔ سبز واری، شوکت، اشتقاقیات، (سہ ماہی) اردو نامہ (کراچی: ترقیٔ اردو بورڈ)، شمارہ ۱۱ تا ۱۸، نیز شمارہ ۲۱ تا ۲۶؛ شمارہ ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۴۳۔

۱۴۔ سلیم، وحید الدین، وضع اصطلاحات، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۷ء [اشاعتِ نو]

۱۵۔ صدیقی، عبدالستار، مقالاتِ صدیقی، ج ۱، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۳ء۔

۱۶۔ صدیقی، عبدالستار، مقالاتِ صدیقی، ج ۲ (مرتبہ ساجد صدیق نظامی)، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۱۵ء۔

۱۷۔ عبدالرحیم، ف، پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۳ء۔

۱۸۔ عبداللطیف، المفرد المرکب، حیدر آباد (دکن) ذخیرہ پریس، ۱۷۔۱۹۱۶ء۔

۱۹۔ عمر، محمد بن، اردو میں دخیل یورپی الفاظ، حیدر آباد دکن: مطبع ابراہیمیہ، ۱۹۵۵ء۔

۲۰۔ عنایت اللہ، شیخ، تحقیق اللغات، لاہور: ناشر ندارد، ۱۹۶۳ء۔

۲۱۔ فرہاد، حسین امیر، ہیں کواکب کچھ، کراچی: ناشر و سن ندارد۔

۲۲۔ لبرمین، اناطولی (Liberman, Anatoly)، Word Origins...And How We Know Them : Etymology for Everyone، (نیو یارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)۔

۲۳۔ مل کیل، یاکو، (Yakov, Malkiel)، Etymology ، کیمرج: کیمرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء۔

۲۴۔میتھیوز، پی، ایچ، (Matthews, P.H.)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، نیویارک:اوکسفر ڈیونی ورسٹی پریس،۱۹۹۷ء۔

۲۵۔ندوی،سید سلیمان،نقوش سلیمانی،کراچی:اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۷ء[دوسرا پاکستانی ایڈیشن]۔

۲۶۔ندوی،عبیداللہ کوثی،مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی میں اردو زبان میں مستعمل الفاظ کی تحقیق،مشمولہ سید سلیمان ندوی (مرتبہ خلیق انجم)،(دہلی:انجمن ترقی اردو،۱۹۸۶ء)،ص ۲۰۱۔۱۶۹۔

۲۷۔ہاشمی،ایس اے،لفظوں کا دل چسپ سفر،کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۰۷ء۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی دیگر کتب

(تخلیق، تحقیق، تنقید، تدوین، ترجمہ)

70 Years of Pakistani Urdu Literature
لغات: تحقیق وتنقید (مرتب)
انتخابِ کلام: میرزا محمو سرحدی (ترتیب وتعارف)
انتخابِ کلام: عنایت علی خان (ترتیب وتعارف)
مطالعۂ غالب کی جہتیں (شریک مرتب)
تلمیحات (تدوین، حواشی، تعارف)
مطالعۂ اقبال کی جہتیں (شریک مرتب)
کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ (تدوین وتحشیہ)
انتخابِ کلام: سید محمد جعفری (ترتیب وتعارف)
ہیرے والا شتر مرغ
انتخابِ کلام: راجا مہدی علی خان (ترتیب وتعارف)
انتخابِ کلام: صوفی تبسم (ترتیب وتعارف)
علمِ لغت، اصولِ لغت اور لغات
لسانیاتی مباحث
لغوی مباحث
اردو کی پانچویں کتاب (شریک مصنف)
لغت نویسی اور لغات: روایت اور تجزیہ (مرتب)
انتخابِ کلام: ظفر علی خاں (ترتیب وتعارف)
اردو لغات: اصول اور تنقید (مرتب)
انتخابِ کلام: مجید لاہوری (ترتیب وتعارف)
اردو میں لسانی تحقیق وتدوین: گزشتہ چند عشروں میں
Oxford Urdu-English Dictionary (مدیر اعلیٰ)

اردو میں تحقیق وتدوین (مرتب)
انتخابِ کلام: اسمٰعیل میرٹھی (ترتیب وتعارف)
سعادت حسن منٹو (شریک مولف)
Iqbal by Atiya (مقدمہ، ترتیب وحواشی)
انتخابِ کلام: حالی (ترتیب وتعارف)
امیر اللغات جلد سوم (تدوین و تحشیہ)
اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتب)
معیاری اردو قاعدہ (شریک مولف)
چمنِ اردو (شریک مولف) (۸ نصابی کتب)
Oxford Mini English-Urdu Dictionary
انتخابِ کلام: اکبر الٰہ آبادی (ترتیب وتعارف)
اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲۱ (مدیر اعلیٰ)
اولین اردو سلینگ لغت
اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲۰ (مدیر اعلیٰ)
عصری ادب اور سماجی رجحانات
اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۹ (مدیر اعلیٰ)
سرخاب کے پر (تراجم)
اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر
نازک صاحب کا بکرا
ہوائیاں
پٹاخوں کا ہنگامہ
خفیہ پیغام